خورشیدِ جاں
جمیل ملک

جمیل ملک

(نظمیں)

۱۹۷۸ء ——— ۱۹۸۸ء

نوید پبلشرز، این ۲۲۲، پراچہ سٹریٹ راولپنڈی

۱۹۹۶ء

ناشر ——— نوید پبلشرز، این/۲۲۲، پراچہ سٹریٹ راولپنڈی
مطبع ——— فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راولپنڈی
تعداد ——— پانچ سو
قیمت ——— ۱۷۵ روپے
سرورق ——— نوید جمیل
کتابت ——— اختر شیخ
عکاسی ——— نوید جمیل

انتساب

لطیف کاشمیری کے نام

یوں تو کتنے رشتے ہیں چاہتوں کی دنیا میں
سب سے بے ریا رشتہ دوستی کا رشتہ ہے

حُسنِ ترتیب

خورشیدِ جاں

جب خورشید ابھرتا ہے تو ساری کائنات جگمگا اٹھتی ہے مگر یہی خورشید جب ایک فنکار کے سراپا میں تحلیل ہو جاتا ہے تو اس خورشیدِ جاں کے آئینے میں جھانک کر پوری کائنات کو اُس کے ان گنت رنگوں، قوسوں اور دائروں کی صورت میں ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شاعر یا فنکار برسوں اِس کائنات کو ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کھلی کتاب کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اس کے اندر اتر کر اُس کے دل، اُس کے دماغ، اُس کی روح اور اُس کے جذبات وحِسّیات پر اَن دیکھے اور اَن جانے انداز میں مرتسم ہوتا رہتا ہے پھر ان حرفوں اور ان لفظوں کے ملاپ سے اُس کے دل کی یہی دھڑکنیں، اُس کے دماغ کی یہی سوچیں، اُس کی روح کی یہی روشنیاں اور اُس کے جذبات و حسّیات کی یہی کروٹیں اُس کے مخصوص وجدان، اُس کے منفرد اندازِ نظر اور اُس کے نویکلے رنگِ سخن میں ڈھل جاتی ہیں جس کے

نت نئے زاویوں سے وہ اِس پھیلتی بڑھتی، جیتی جگمگاتی ہوئی کائنات کو خود بھی دیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی دکھاتا ہے۔

وجدان، اندازِ نظر اور رنگِ سخن کی اس ہمہ رنگی و ہم آہنگی کی تحلیل و تشکیل کا دوسرا نام "خورشیدِ جاں" بھی ہے۔ اسے کسی شاعر یا فنکار کا آئیڈیل بھی کہا جا سکتا ہے جسے وہ عمر بھر ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ اگر یہ خورشیدِ جاں اُس کے اندر اور باہر جگمگا رہے تو ساری کائنات ایک دلہن کی طرح روشنیوں میں نہاتی رہتی ہے لیکن اگر یہی خورشیدِ جاں گہن میں آجائے تو نہ صرف پوری کائنات اندھیرے کی لپیٹ میں آجاتی ہے بلکہ شاعر یا فنکار کے اندر کی دنیا بھی اندھیر ہونے لگتی ہے۔ پھر بھی خورشیدِ جاں کی تحلیل و تشکیل اور خمیر و تعمیر میں جن رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں اور جذبوں کی آمیزش ہوتی ہے وہ باہر کے سورج کے گہنا جانے کے باوجود خورشیدِ جاں کو بجھنے نہیں دیتی بلکہ اپنے اندر کی چھوٹ سے باہر کے گہنائے ہوئے سورج کو بھی گہن کے زنداں سے رہائی دلانے کے تخلیقی سفر پر ہمہ وقت گامزن رہتی ہے۔ تا آنکہ پسِ آئینہ چمکتے ہوئے اس خورشیدِ جاں کو پیشِ آئینہ لا کر طلوعِ فردا کی بشارتوں سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

'خورشیدِ جاں' کی نظمیں جس دور میں کہی گئی ہیں وہ بظاہر گہنائے ہوئے سورج ہی کا دور ہے تاہم ان نظموں کے

باطن سے خورشیدِ جاں کی وہ روشنیاں بھی پھوٹ رہی ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور جن میں ہم سب کا حصّہ ہے۔

جمیل ملک
۲ مئی ۱۹۹۰ء

دریچے کھلے ہیں

کبھی کوئی جگنو
اندھیرے کے پر کاٹ دیتا ہے
کومل سی مشعل جلا کر
مری روح میں چاندنی سی بچھاتا ہے وہ نور کا ایک نقطہ بنا کر
کبھی کوئی تارا
سرِ شام جادو جگاتا ہے
اور پیار کے نرم لہجے میں کہتا ہے
'آؤ مرے چاند آؤ مجھے جذب کر لو
مرے چار سو نور کا ایک ہالہ بناؤ'

کبھی اک شرارا
دہکتے الاؤ سے دامن چھڑا کر
مرے ریشے ریشے میں دیپک جلا کر
مرے جسم کو جگمگاتا ہے
سروِ چراغاں بنا کر

کبھی کوئی آنسو

مری آنکھ سے میرے دل میں ٹپکتا ہے
اس ایک آنسو سے کتنے ہی چشمے نکلتے ہیں
سیراب کرتے ہیں
میری امیدوں کی سوکھی ہوئی کھیتیوں کو

کبھی کوئی جھونکا
کرن اور خوشبو کی انگلی پکڑ کر
مرے پاس آتا ہے ہولے سے جھک کر جگاتا ہے
اُجلی فضا میں اڑاتا ہے مجھ کو
چہکتے پرندوں کا ساتھی بنا کر

وہ جگنو ہو تارا ہو
کوئی شرارا ہو، آنسو ہو یا کوئی جھونکا
سبھی شوق کے مرحلے، میرے اظہار کے زاویے ہیں
یہاں سے وہاں تک
زمیں سے زماں تک
انہی کی محبت، انہی کی رفاقت سے
یہ فکر و فن کے دریچے کُھلے ہیں
یہ سب میری پرواز کے سلسلے ہیں

فطرت اور انسان

یہ مناظر کی کار فرمائی
بزمِ فطرت کی جلوہ پیرائی

ندیوں کا یہ نرم نرم بہاؤ
دامنِ کوہ کی یہ زیبائی

غول کے غول یہ پرندوں کے
میں بھی سودائی یہ بھی سودائی

چاندنی دُھوپ رُوپ شامِ شفق
کتنے رنگوں میں رنگ ِ یکتائی

آسمان و زمیں سحاب و گلاب
دیکھ کیا کیا ہے عالم آرائی

یہ طلوع و غروب کا انداز
وقت لیتا ہو جیسے انگڑائی

اک تحیّر کہ جو عطا کر دے
آنکھ کو سوز، دل کو بینائی

اک تفکّر کہ جس سے حاصل ہو
ایسی رفعت، ہو جس میں گہرائی

ہے ازل سے یہی مقام اپنا
میں قدیم و جدید قصّہ ہوں

ماں کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے
میں بھی فطرت کا ایک حصّہ ہوں

منظر منظر کے ساتھ

اپنی صورت میں اپنی سیرت میں
چاند تاروں کی روشنی بھر لیں
سیکھ لیں راز رہنمائی کے
خوش ادائی کے، دلربائی کے
صبح کے جلوۂ تقدس سے
روح کے سارے داغ دھل جائیں
ذہن تازہ ہوں، دل شگفتہ ہوں
جب دریچے سحر کے کھل جائیں
جب صبا گدگدائے کلیوں کو
لہلہائیں ہزار رنگ کے پھول
دھو کے چہرے غبارِ شبنم سے
چلتے سورج کے ساتھ ساتھ چلیں
اپنے اندر کی آگ سے ہر گام
جذبۂ آگہی میں ہم بھی جلیں
اک چمک، اک دھنک سے آنکھوں میں
دور تک ہر طرف اجالا ہو

دیکھ لیں وہ جو ہونے والا ہو
آج سے، کل سے آشنائی ہو
عرش سے بھی پرے رسائی ہو
ایسا اندازِ خود نمائی ہو

ڈھلتی شام پگھلتا سُورج

ڈھلتی شام وہ محبوبہ ہے
جو دن بھر بچھڑے عاشق کا رستہ تکتے تکتے
اپنے لہو میں ڈوب گئی ہے
اُس کی لاش پہ افتاں وخیزاں
لو سورج بھی آپہنچا ہے
تپتی دھوپ کی گرم رقابت کے صحرا میں جلتے جلتے
دن بھر تنہا چلتے چلتے
وہ بھی تھکن سے چُور ہُوا ہے
اپنی مسافت کا سب بوجھ اتار چکا ہے
محبوبہ کے سرخ وسیہ ہونٹوں کو چوم رہا ہے
لو اب وہ بھی ڈوب گیا ہے
چاندنی رات نے پیار سے اپنے ہاتھ بڑھا کر
اپنی پھیلی گود میں لاکر
صدیوں کے اِن بچھڑے ہوؤں کو
سیمیں کرنوں کے شفاف کفن میں ڈھانپ دیا ہے
ڈھلتی شام پگھلتے سورج کا سنجوگ امر ہے
یہ صدیوں کی چاہت کا انمول ثمر ہے

خواب کنارا

خواب محل میں نیند کی پریاں
آئیں آکر لوٹ گئیں

دل میں بھولی بسری یادوں کا وہ شور ہے
میں کروٹ پر کروٹ لیتا ہوں
جس کشتی کا خواب کنارا کوئی نہیں ہے
میں وہ کشتی کھیتا ہوں
نیند آئے تو خواب سمندر کے بجرے پر بہتا بہتا ـــــ
خواب کنارا دیکھ آؤں
جی کرتا ہے تو اُس خواب کنارے پر حیران کھڑی ہو
میرا رستہ دیکھ رہی ہو
میں جب تیری نظروں میں لہراؤں
تو بے ساختہ آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھائے
جنم جنم کی ترسی باہیں
میرا استقبال کریں
ماضی کے ہر لمحے کو وابستۂ حال کریں
خواب حقیقت بن جائے
لیکن کیا جانے، کب نیند آئے ـــــ!

علامت

میں اک آئینہ ہوں
آئینے میں میری صورت
آئینے کے پیچھے میری سیرت
دونوں کے رنگوں میں کتنے رنگ کھلے ہیں
دونوں اک مرکز پر آن ملے ہیں
اس مرکز سے کتنی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں
کتنے عکس ہیں جن کے رقص کی قوس قوس سے
پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں
روشنیوں اور رنگوں کی برسات میں
میرا تن من بھیگ رہا ہے
مجھ کو چھو لو تو میں چھوٹی موٹی سی بن جاؤں
اور مجھے محسوس کرو تو میں ہر دل میں دھک دھک دھڑکوں
سب کے دل کی بات کروں یوں اپنے دل کی بات سناؤں
خوشبوؤں کے سو بھیدوں میں لپٹی لپٹائی مورت ہوں
لیکن جو لفظوں کے پیکر سے جھانکے میں وہ صورت ہوں
مجھ کو پہچانو میں کیا ہوں
جھلمل جھلمل، جھلمل جھلمل آئینہ ہوں

رنگوں کی جھنکار

مسرت نرم و نازک ایک تتلی ہے
جو اپنے پیارے پیارے رنگ پھولوں سے چُراتی ہے
مسرت ایک لہراتی دھنک ہے
گہرے نیلے آسماں میں
سات رنگوں کا ہمیں جھولا جھلاتی ہے
مسرت ایک نغمہ، ایک دُھن ہے
سات سُر جس میں سمائے ہیں
مسرت ایک لَو دیتا ہُوا تنہا دیا ہے
رات بھر کٹیا کے دل میں جھلملاتا ہے
مسرت ایک ضو دیتا ہُوا قطبی ستارا ہے
مسافر کے لیے منزل کا روشن استعارہ ہے
مسرت باپ کی انگلی میں وہ بیدار جذبہ ہے
کہ جس کو تھام کر بچپن
افق سے تا افق پھیلی ہوئی حیرت کی سرحد پار کرتا ہے
مسرت حُسنِ فطرت کی طرح
ماں کی کُھلی آغوش ہے

سرسبز لوری ہے
مسرت رنگتِ شام و سحر کو
دل کے دھاگے میں پروتے والی
نازک سی کرن
باریک ڈوری ہے
مسرت روح کی جھنکار ہے
گہرائی میں اُترو
اسے سُن لو
مسرت کے ہزاروں رنگ ہیں
جو رنگ بھی تم کو پسند آئے
وہی یہ چُن لو

خیال کی دھنک

ایک چہرہ مرے تصوّر میں
مسکراتا ہے جگمگاتا ہے
جب ہَوا دائرے بناتی ہے
اور بارش بھی ساتھ لاتی ہے
ایک چہرہ بھی اس چھما چھم میں
چاہتوں ہی کے گیت گاتا ہے
اور بارش کے بعد جب ہر بار
سات رنگوں کی پینگ پڑتی ہے
سات رنگوں کی میناکاری سے
ایک چہرہ نکھرتا جاتا ہے
مجھ کو اپنی طرف بلاتا ہے

ایک چہرے کی کتنی شکلیں ہیں
روز سورج کے ساتھ آتا ہے
صبح کی سانس میں پروئے ہوئے
بیج بوتا ہے شوخ کرنوں کے

اور اُگتا ہے میری دھرتی سے
سبز کونپل میں سرسراتا ہے
ٹوٹ کر جب بہار آتی ہے
یوں مجھے آئینہ دکھاتی ہے
دیکھتا ہوں مَیں پھر یہی چہرہ
اِس کے چہرے پہ میرے نقش و نگار
میرے چہرے پہ اس کا روپ نکھار
دونوں چہروں پہ ایک ہی چہرہ
جس پہ پھولوں کا دلربا سہرا

سرمدی ، سرمئی دھندلکے میں
شام ، ہر شام دیکھتا ہوں اسے
پہلے تارے میں جھلملاتا ہے
رات جب چاندنی بچھاتی ہے
پہلے تارے کی روحِ سیمابی
سارے تاروں میں دوڑ جاتی ہے
دُور افق پار سے اُبھرتے ہوئے
چاند کو درمیاں بلاتی ہے
جس کے آئینۂ جمال میں وہ

دیکھتی ہے تمام چہروں پر
ایک چہرے کی سب ضیا تابی
کتنے اسرار فاش کرتی ہے
شب کے حیرت کدے میں بکھری ہوئی
نکہت و نور کی یہ ارزانی!
کون اس کو سمیٹ سکتا ہے!
لیکن اس وقت تو یہ تابانی
ایک چہرے میں ہے سمائی ہوئی
یہی چہرہ جو جاودانی ہے
جس پہ لکھی ہوئی کراں تا کراں
تیری میری ابد کہانی ہے

بادِ شمال کے ساتھ ساتھ ایک سفر

(ایک نظم باندازِ غزل)

نانگا پربت سے گزر آئے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ گھر آئے ہیں

راکاپوشی کا لیے حسن و جمال
وادیٔ گل میں اُتر آئے ہیں

راہِ ریشم ہے جہاں راہ نما
ہم وہاں پا بہ سفر آئے ہیں

آگ جن میں ہے چناروں جیسی
اُن جیالوں کے نگر آئے ہیں

برف زاروں پہ چمکنے کے لیے
صورتِ حسنِ قمر آئے ہیں

ہم ہیں تعبیر اُنہی خوابوں کی
جو یہاں خواب نظر آئے ہیں

وہ حسن ہو کہ ہو بابرؒ ، کیا کیا
خشک شاخوں پہ ثمر آئے ہیں

سارے عالم میں نہیں جن کی نظیر
وہ یہاں کیمیا گر آئے ہیں

جن کے کنکر بھی ہیں ہیرے موتی
جوہری وہ بھی نظر آئے ہیں

گُم تہِ خاک ہیں جو اہلِ نظر
بن کے ہم اُن کی خبر آئے ہیں

ہم نہیں بارکشِ میر و وزیر
ہم بعنوانِ دگر آئے ہیں

سندھ[۲] تاریخ بھی تہذیب بھی ہے
اس میں صدیوں کے بھنور آئے ہیں

جس طرف چاہے اڑا بادِ شمال
تیرے یارانِ سفر آئے ہیں

یہی سوغاتِ سفر ہے اپنی
جھولیاں پیار سے بھر آئے ہیں

گفتگو گو نہ شہیدوں سے ہوئی
اُن کا دیدار تو کر آئے ہیں

جو پہاڑوں کو کریں نرم و گداز
سیکھ کر اُن سے ہنر آئے ہیں

جس طرف جائیں اُجالا ہے جمیلؔ
ساتھ ہم لے کے سحر آئے ہیں

۱ ۲: شمالی علاقوں کو آزاد کرانے والے غازی
۲: دریائے سندھ

اُڑان

میں نے بادِ صبا سے کہا
میرے پیارے وطن کی نگارِ وفا
تُو نے جس سرزمیں سے چرایا ہے یہ حسن ، یہ رنگ و بُو
تیرے ایک ایک جھونکے میں ہے جس کا رقصاں لہو
تُو ہے جس صبح کی آبرو
اُس کے رنگوں ، امنگوں کی ساری کہانی سُنا
مجھ کو بھی پَر لگا کر اڑا
میری پیاسی نگاہوں کو ایک ایک منظر دکھا
— تُو نے سن لی مری بات ، اے شوخ ، اے دلربا —!

اب میں بادِ صبا
تیرے جھولے میں ہوں
آسمانوں کو چھُوتے ہوئے تیز رو اک بگولے میں ہوں
مجھ کو لگتا ہے یہ میرے شاہیں صفت نونہالوں کی پرواز ہے
اُن کے ہمراہ اڑتی ہوئی میری آواز ہے
اور نیچے سمندر پہ جو بادباں ہیں کھُلے
اِن کے لہراؤ میں ، ان کے پھیلاؤ میں

میرے کتنے شناور جوانوں کے جذبے گھُلے
آزمائش کے ہر بحر کی لہر میں
موتیوں کی طرح جو صدف میں تلے
اک طرف دودھیا بادباں
اک طرف برف کی چوٹیاں
چوٹیوں سے گزرتے ہوئے بادلوں کے یہ پُل
اور ہر پُل کے پہلو بہ پہلو پہاڑوں کے یہ سلسلے
وقت کی انتہاؤں سے ملتے ہوئے
پتھروں سے اُلجھتے ہوئے کتنے چشمے رواں
جن کے میٹھے ترنم میں سازوں کی جھنکار سی
کتنے آبی پرندوں کی چہکار سی
کتنی مانوس، کتنی جواں
دھڑکنوں کی زباں داستاں داستاں
دُور مشرق سے سورج ابھرتا ہُوا
اس کے چہرے پہ نکھری ہوئی آتشیں سُرخیاں
جن کی کرنوں کی بارش سے سارا وطن گلستاں گلستاں
لہلہاتا ہُوا، جگمگاتا ہُوا
وادیاں، شہر، بَن
قوس در قوس، رنگوں، نظاروں، بہاروں میں ڈوبے ہوئے

محنتوں کے ثمر، آرزوؤں کے بڑھتے ہوئے حوصلے
شاہراہوں پہ پھولوں کی ہنستی ہوئی، مسکراتی ہوئی ٹولیاں
ٹولیوں کی رفاقت میں ہمجولیاں
رقص کرتی ہوئی تتلیاں
گاؤں گاؤں میں پنگھٹ پہ گاتی ہوئی کتنی پنہاریاں
گاگریں سر پہ رکھے ہوئے
جیسے چلتی ہوئی کھیتیاں
جیسے آکاش سے میری دھرتی پہ اُترتی ہوئی کہکشاں کہکشاں

اور صحراؤں میں
دُور اُفق پار تک کی خبر لے کے آتے ہوئے قافلے
جن کے اُونٹوں کی لمبی قطاروں میں
اٹکے ہوئے ساربانوں کے دل
یوں دھڑکتے ہوئے جیسے بجتی ہوئی گھنٹیاں
نغمۂ جاوداں، بیکراں بیکراں

—— میں بھی بادِ صبا
میرے پیارے وطن کی نگارِ وفا
تیرے جھولے کے رقصاں بگولے کی اک جھیل ہوتا ہُوا
نغمۂ جاودانی میں تحلیل ہوتا ہُوا
تیری تمثیل ہوتا ہُوا

اپنے سوہنے وطن کی کہانی میں تبدیل ہوتا ہُوا
مَیں بھی بادِ صبا
تیری رنگیں ادا بن گیا ہوں
مَیں کیا تھا
مگر کیا سے کیا بن گیا ہوں

ورثہ

حال کے دروازے کی کنجی
تم ماضی کے تہہ خانے میں بھول آئے ہو
حال کا چپ چپ دروازہ کیسے کھولو گے
حال کا دروازہ ہی کھل نہ سکا تو
مستقبل کا دروازہ بھی بند رہے گا
تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے
تم نے حال کی کنجی کھو کر
ماضی حال اور مستقبل سے کیا پایا ہے
سوچو ، سوچو
ذات کے تہہ خانے سے نکلو
ذات کا تہہ خانہ ماضی ہے
ماضی سے کچھ لینا ہے تو
ماضی کے اس تہ خانے سے حال کی کنجی ڈھونڈ کے لاؤ
حسن و ادب کے ، شوق و طلب کے ، صبحِ طرب کے
فکر و نظر کے ، سوز و اثر کے ، شام و سحر کے
ان انمول خزانوں کے پھولوں والے دروازے کھولو

جن کی پھیلتی بڑھتی خوشبو
جن کے بگمگ جادو سے
حال کے سارے دروازے پھر کھل جائیں گے
مستقبل کی راہیں بھی روشن تر ہوں گی
— ماضی، حال اور مستقبل سب ایک روایت
زندہ اور بھرپور روایت کی کڑیاں ہیں
یہ وہ صدیوں کا قصّہ ہے
جس میں ہم سب کا حصّہ ہے

سرچشمہ

تُو ماں ہے
ماں ہو کر بھی تُو
دنیا والوں سے بینائی مانگے
بیٹے تیری آنکھ کا نور ہیں
اور تُو خود بینائی کا روشن سرچشمہ
لیکن کیا اندھیر ہے
تُو بیٹوں کے ہوتے
آج خود اپنے ہی روشن سرچشموں سے محروم ہوئی ہے
تیرے بیٹے
ساری دنیا کو بینائی بانٹنے والے
تجھ سے آنکھیں موڑ گئے ہیں
تجھ کو اکیلا چھوڑ گئے ہیں

تجھ کو اکیلا چھوڑنے والے تیرے بیٹے
روشنیوں کے گہوارے سے پیار کا رشتہ توڑنے والے تیرے بیٹے
آپ بصیرت سے عاری ہیں

اوروں کو بینائی کیا تقسیم کریں گے!
اپنی ماں کو بھولنے والے دھرتی ماں کی کیا تعظیم کریں گے!

تو ماں ہے اور تیرے بیٹے
تیری آنکھ کا نور ہیں
اور تو خود بینائی کا روشن سرچشمہ
اُن کی گمراہی کو راہ پہ لاکر
آج پھر اپنے پاس بلا لے
اپنے دل کی گونج سے
اُن کے دل میں سویا پیار جگا لے
وہ آجائیں تو تیری آنکھوں کے یہ اندھے دروازے
کُھل کُھل جائیں
گھر کے سارے تیرہ کمرے
روشنیوں سے دُھل دُھل جائیں
ماں بیٹوں کی ہمراہی میں چلتی جائے
ساری دھرتی کی تقدیر بدلتی جائے

تُو رنگوں کا موجد ہے

(موجد کے لیے ایک نظم)

جینے کے تھے ڈھنگ بہت
شوق بہت تھے رنگ بہت

چپ چپ گیلے سِیلے رنگ
سچے اور سجیلے رنگ
سارے نیل گگن کے رنگ
دھرتی اور چمن کے رنگ

رنگوں کو تجھ سے پہلے
خود اپنی پہچان نہ تھی
جسم بہت تھے رنگوں کے
لیکن اُن میں جان نہ تھی

تیرے قلم نے کُن، لکھا
پھول میں خوشبو جاگ اٹھی
رنگوں کو پہچان ملی
فن سے اجلی آگ اٹھی

لفظوں کو آہنگ ملا
جس نے دیکھا بول اٹھا

تُو رنگوں کا مُوجد ہے
تو رنگوں کا مُوجد ہے

استعارہ

مجھے کیا خبر تھی
کہ تم ہی مری سوچ کا استعارہ بنو گے
محبت کے پیاسے مسافر کو روکو گے
چاہت کا پانی پلاؤ گے
اور عمر بھر اس کا تنہا سہارا بنو گے
ستارا بنو گے

ستارا
جو ہر شام یوں منتظر ہو گا میرا
کہ کب چاند افق پر نظر آئے
اور کب ستارا
محبت کا روشن جبیں استعارہ
عجب شانِ بے اختیاری سے آغوش وا کر کے آگے بڑھے
اور خود اُس کی آغوش میں ڈوب جائے
سحر تک یونہی اُس کے سینے کی خلوت میں کھویا رہے
اُس کے روشن شبستاں میں سویا رہے
صبح دم چاند بچھڑے

تو وہ گرم سورج کی بھٹی میں جلتا ہُوا
شام تک پھر سے کندن بنے
چاند کی راہ دیکھے
ماہ میں چاہ دیکھے

تم مری سوچ کا جاوداں استعارہ ہو
روشن ستارا ہو
تم چاند سے بھی حسیں ہو
کہ تم ہی مری چاندنی ہو
مری آگہی ہو
مری زندگی ہو

چھاؤں

وہ ایک نٹ کھٹ شریر لڑکی
جو میرے بچپن کے مرغزاروں میں تھی سہیلی
جواں ہوئی جب تو سرخ ڈولی میں
اُس کو لے کر کہار آئے
مرا ہی گھر تھا جو اُس کے دل کی مراد ٹھہرا
اور اب کہ وہ ایک ماں ہے
اُس کا وہ پیار، میرا وقار
بچوں کا حسن بھی ہے، دلار بھی ہے
وہ ایک چھتنار سارے گھر کا
اُسی کی شاخوں میں نغمہ خواں ہیں
حسیں پرندے مرے لہو کے
یہ پھول پھل میری آرزو کے
اُسی کے سائے میں پل رہے ہیں
اُسی کی راہوں پہ چل رہے ہیں
اب ان کی سرسبز کونپلوں سے
نئے شگوفے نکل رہے ہیں

دو پھول

— میں اک پھول سُورج مکھی کا

مہکتا ہوں دن بھر

بھٹکتا ہوں ہر سو تری جستجو میں

تو وہ رات رانی، محبت ہے جس کی کہانی

جو شب بھر مہکتی ہے میری طلب میں

کہاں میری قسمت میں خوشبو

جو ہے تیرے کاشانۂ زلف ولب میں

کہاں تیرے پہلو میں دن کا وہ آہو

کہ تجھ پر چلے عمر بھر جس کی چاہت کا جادو

جدائی ہمارا مقدّر

مگر اس کا آغاز بھی میری خوشبو

مگر اس کا انجام بھی تیری خوشبو

یہی ہے ہماری محبّت کا حسنِ تسلسل

وصالِ مسلسل

اسی کے جلو میں رواں وقت کا کارواں ہے
ہماری محبّت کی مانند یہ بیکراں ہے
یہی بے کرانی ، روانی، ہماری نشانی
مَیں اک پھول سورج مکھی کا
تُو اک رات رانی

رشتوں کی مہک

تو میرے رُوبرو تھی

تیرے چہرے پر
سلونی ماتا کا وہ تقدس تھا

کہ میرے جی میں آئی

بے محابا تجھ کو میں سجدہ کروں

پیاسی نظر سے چوم لوں تجھ کو
معاً ننھی سمن ، میری نواسی

میری وہ پیاری سی چڑیا
یوں پُھدکتی ، دوڑتی آغوش میں آئی
مجھے یوں توتلی آواز میں 'نانا' کہا

یوں چہچہائی

میں نے یہ سمجھا
مری بیٹی کا بچپن لوٹ آیا ہے

ہو تیرا عکس ہے، تیرا ہی سایا ہے
۔مری ننھی سمن یوں ڈھل گئی بوسوں کی بارش میں
کہ تب سے آج تک
ننھی صداقت کا ہر اک بے داغ سجدہ بھی
بہ حسنِ صبح لکھتا ہوں برنگِ شام لکھتا ہوں
مَیں تیری ماما کا نرم بوسہ بھی
سمن کے نام لکھتا ہوں

چاند پر پہلا گھر

مرے ننھے نواسے نے
عجب اک تیلیوں کا گھر بنایا ہے
وہ نانی ماں سے کہتا ہے
یہ میرا گھر ہے
اس میں مَیں رہوں گا
اور میرے ساتھ ہوں گے میرے ابا، میری اماں بھی
مرے دادا بھی دادی بھی،
مرے نانا بھی، نانی بھی،
مری پھپھو بھی، خالہ بھی،
مرے ماموں بھی، چاچا بھی،
— مَیں اُس کی ساری باتیں سُن رہا ہوں
دل ہی دل میں سوچتا ہوں
یہ تو باتیں ہیں سبھی میرے زمانے کی
مگر وہ تو نیا انسان ہے اُس کی تو دنیا اور ہی ہوگی
وہ جب بچپن کی سرحد پار کر جائے گا
اور اگلی صدی میں پاؤں رکھے گا

تو کتنی شان سے کہتا پھرے گا
تِتلیوں کا گھر بہت چھوٹا ہے، بے ڈھنگا ہے، اکجا ہے
یہاں تو سانس گھٹتا ہے
یہاں تو دم نکلتا ہے
میں اپنے نیلگوں خوابوں کی برقی طشتری
پھیلی، کھُلی، اونچی فضاؤں میں اڑاؤں گا
مَیں اپنی ہم سفر کو ساتھ لے کر
اپنا عالیشان بنگلہ چاندنگری میں بناؤں گا
مَیں اس کے ایک اک کمرے میں
اپنے سارے خوابوں کو سجاؤں گا
اور اپنے پیارے ابا، پیاری امّی کے لیے
یہ تِتلیوں کا گھر
زمیں پر چھوڑ جاؤں گا ــــــــ،

سچے سچے خواب

وہ بھی دن تھے
جب مَیں خواب یہی دیکھا کرتا تھا
میرا بھی چھوٹا سا گھر ہو
جس میں پیار کے پھول کھلے ہوں
گھر کی ساری دیواروں پر
جھلمل جھلمل دیے جلے ہوں

یہ بھی دن ہیں
میرا اک چھوٹا سا گھر ہے
بیوی ہے، بچّے ہیں
گھر کی ساری دیواروں پر
پیار کی امرت بیل چڑھی ہے
میرے بچوں کے کمروں میں
علم کی خوشبو پھیل رہی ہے
میرے خواب سبھی سچّے ہیں

میرا بیٹا

جو اب قد میں مجھ سے بھی اونچا ہے
اپنی ماں سے کچھ روٹھا روٹھا رہتا ہے
آتے جاتے مجھ سے آنکھوں آنکھوں میں کہتا ہے
میرا بھی سپنا سچا ہو
میرا بھی چھوٹا سا گھر ہو

واپسی کا سفر

چلو آج ہم
پھر اُنہیں شاہراہوں پہ واپس چلیں
جن پہ چلتے ہوئے
طے ہوئی ہے یہ عمروں کی لمبی مسافت
وہ گاؤں، وہ پھیلی ہوئی کھیتیاں
کچے پکے مکانوں کی جنّت
وہ جنّت میں پلتی ہوئی چاہتیں
چاہتوں کی وہ لذّت — !
— اگرچہ وہ لگتا ہے سب ایک سپنا
وہاں منتظر ہوگا کوئی تو اپنا
بڑا فاصلہ ہے، بہت دُور کا یہ سفر ہے
مگر آج ہم پھر انہیں شاہراہوں پہ واپس چلیں گے
اگر ہم کو بچپن بھی گاؤں کی سرحد پہ لینے نہ آیا
جوانی کی جنّت کو بھی
لُوٹ کر لے گئے، اپنے اندر کے وحشی لٹیرے
تو پھر بھی
تناور سے اک پیڑ پر اپنے دو نام کندہ تو ہوں گے — !

خواب گلاب

لو میرے گھر کے آنگن میں
چاہت کا پہلا پھول کھلا
میں جس کی تلاش میں نکلا تھا
وہ راہی مجھ سے آن ملا
اس راہی کو گلزاروں میں
خوشبو کی طرح چلتے دیکھا

جو راہی اب ہمراہی ہے
کل مجھ سے بھی آگے ہو گا
یہ ماضی، حال اور مستقبل
سب کھیل ہے آگے پیچھے کا
یہ دھرتی امبر ایک ہیں سب
بس فرق ہے اُوپر نیچے کا
یہ سبز زمیں، وُہ نیل گگن

یہ اپنی ہے، وہ اپنا ہے
سمجھیں تو ہے ان میں کیا کیا کچھ
ورنہ یہ سب کچھ سپنا ہے

آویزش

وہ جو ناکام آرزو ہیں ہمیں
کتنی شدت سے اپنے بچوں کو
روکنا چاہتے ہیں چاہت سے
جیسے یہ بھی گناہ ہو کوئی
وہی بچے مگر جواں ہو کر
سب سے پہلا سوال کرتے ہیں
شہرِ ممنوع کا پتہ کیا ہے
جس شجر پہ ہے پھول چاہت کا
وہ شجر کس نگر میں ہوتا ہے
باغِ جنّت سے جدِّ امجد نے
کون سا پھل تھا جو چرایا تھا
اور اُس پھل کا ذائقہ کیا ہے
اُن کے اک اک سوال کی حیرت
دل میں کتنے سوال اٹھاتی ہے
دل کے گنبد سے سب سوالوں کا
ایک جیسا جواب آتا ہے

ذائقہ پھل کا جاننے کے لیے
پھل کا چکھنا بہت ضروری ہے
دھڑکنوں کی طرح محبت کو
دل میں رکھنا بہت ضروری ہے
ورنہ یہ لفظ روٹھ جاتا ہے
آتی جاتی تمام نسلوں کا
ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جاتا ہے

میراث

عمر بھر مَیں حقائق کی سنگیں چٹانوں سے لڑتا رہا
پھر بھی میرے حسیں خواب
اب تک ادھورے رہے
میرے بیٹے ہو تم اور میرے برابر کھڑے ہو
تمہیں اور تو کچھ نہ میں دے سکوں گا
مرے ہاتھ خالی ہیں لیکن
مرے پاس خوابوں ، گلابوں کا
سورج کی لَو سے چمکتا ہُوا
اور اندر کی خوشبو سے مہکا ہُوا
یہ خزانہ بہت ہے
یہی میرا ورثہ ہے لے لو
اسی روشنی سے
تم اپنے چراغوں کو روشن کرو
میرے افکار کی دیو مالا میں
تُم اپنے رنگوں کا جادو بھرو
کہ بھر جائیں

یہ رفتہ و حال و آئندہ کے سارے گھاؤ
سے موج در موج بہتی ہوئی
ناؤ اپنی کنارے

وہ سب خواب جو ہم نے دیکھے تھے
پورے ہوں سارے

سوغات

کوئی ماں کہہ رہی ہے اپنے بچے سے

اندھیرا بڑھ رہا ہے
اور تم اب تک نہیں آئے
مگر ممتا کو جا کر کون سمجھائے

بھیانک جنگ کا عفریت سرحد پار کر لے
اور گھر تک بھی چلا آئے
تو بچے اپنی ممتا کو بچانے کے لیے
گھر سے نکل کر
راہ کی دیوار بن جاتے ہیں
اپنی جان کی بازی لگاتے ہیں
وطن کے کام آتے ہیں
اندھیری رات ہو جائے
مگر بچہ نہ گھر آئے
تو اُس کا چاند سا پیکر
اندھیرے میں ابھرتا ہے
وہ بوڑھی ماں کے سینے سے لپٹ کر
اُس کا ماتھا چومتا ہے

اور کہتا ہے
'مجھے دیکھو
مَراکب ہوں، مَیں زندہ ہوں
مَیں اس خُونیں دہن عفریت کی
مغرور گردن توڑ آیا ہوں
مَیں اپنی جان دے کر
امن کی سوغات لایا ہوں'

مناجات

یہ مانا گنہگار بندے ہیں تیرے
مگر کب تک آخر
گناہوں کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے یونہی چلتے رہیں گے
ہمیں آج پھر طُور پر اپنا جلوہ دکھا
سچ کا رستہ بتا
وقت کے جتنے فرعون ہیں
اُن سے لڑنے کی ہمت عطا کر
اگر ہم تری اس توجہ کے قابل نہیں ہیں
تو پھر یوں تمسخر اڑانے سے بہتر ہے
ہم کو پھر اک بار غرقِ یمِ نیل کر دے
ہمیں پھر عجائب گھروں کے عجوبوں میں تبدیل کر دے
کہ سب آنے والے
ہمیں درسِ عبرت میں ڈوبی ہوئی ایک حیرت سے دیکھیں
کہیں
کس مصوّر کا شہکار تھے ہم ؟
ہمارا خدا کون تھا ؟

زرد بے درد موسم

حبس کے زرد موسم میں
بھولے پرندے
خوف سے آشیانوں میں دبکے ہوئے
منتظر ہیں
کہ کب کوئی چھینٹا پڑے
کب ہوا کا کوئی نرم جھونکا چلے
اور وہ آشیانوں سے نکلیں
اڑیں، زخم سہلائیں اور اپنی چہکار سے
بستیوں، وادیوں کا طلسمِ گراں توڑ دیں

کون بھولے پرندوں کو جا کر بتائے
کہ جب تک زمیں کو
لہو اور پسینے کی سوغات ملتی نہیں
کوئی بھی فصل تیار ہوتی نہیں
پھول کھِلتے نہیں
اَبر اٹھتا نہیں
ہُن برستا نہیں
زخم بھرتے نہیں
قافلے رنگ و بُو کے اُترتے نہیں
زرد بے درد موسم گزرتے نہیں

تن اُجلے، من مَیلے

وہ بھی دن تھے
سونا مٹی کے بھاؤ بکتا تھا
یہ بھی دن ہیں
مٹی سونے میں تلتی ہے
سونا مٹی ایک ہوئے ہیں
انساں مٹی کے پُتلے تھے
لیکن اب سونے کے بت ہیں
بے حِس ، بے جاں
درد سے عاری
ان سے تو مٹی کے وہ پُتلے اچھے تھے
جو میرے دکھ سُکھ کے ساتھی تھے
میرے اپنے تھے
میرے بچپن کے سپنے تھے

ـــ بچپن کی معصوم فضا واپس آ جائے
تو شاید سونے کے بت بھی بولیں
پیاری پیاری مٹی سے انسان کا جو سچا رشتہ ہے
اس رشتے کے امرت رس کی شیرینی سے
باہر سے چمکیلی اُجلی اندر سے یہ جنم جنم کی مَیلی مَیلی رُوحیں دھولیں

پاداش

میں علامت پسند تھا اتنا
جتنے کردار تھے مری تخلیق
سب تھے بے چہرگی کے مارے ہوئے
اپنے ہونے سے بھی وہ خائف تھے
اور نہ ہونے کا غم بھی تھا اُن کو
میں اکیلا تھا میری تنہائی
اُن کے دم سے رہی مگر آباد
پھر مجھے ان سے خوف آنے لگا
میرا چہرہ مجھے ڈرانے لگا
— اب مجھے دیکھ دیکھ کر اکثر
میرے اپنے ہی اجنبی پیکر
وہ ہیولوں سے ان گنت لشکر

میری بے چہرگی پہ ہنستے ہیں
میری بے چارگی پہ رہ رہ کر
بے سبب قہقہے لگاتے ہیں
میں اکیلا ہوں اور وہ اتنے
میرے احباب بھی نہیں جتنے
— نہ مجھے اتنی جگ ہنسائی دے
یا خدا آ مجھے رہائی دے
سرگراں، بیکراں اندھیرے میں
پھر مجھے اپنا رہنما کر دے
میرا چہرہ مجھے عطا کر دے

اپاہج

جسے گھر سے بیساکھیاں لے کے چلنے کی عادت پڑی ہو
کبھی اپنی بیساکھیاں چھوڑ کر گھر سے نکلے
تو یوں اُس کو محسوس ہوتا ہے جیسے
وہ ہر گام پر ڈگمگاتا ہُوا، لڑکھڑاتا ہُوا چل رہا ہو

ہماری بھی حالت عجب ہے
سراپا سلامت ہے اور قامت و قد بھی ویسے کا ویسا ہے لیکن
جو بیساکھیاں اپنے آبا و اجداد سے
ہم نے ورثے میں پائی ہیں
اُن کے بغیر آج بھی
دو قدم ہم میں چلنے کی ہمت نہیں ہے
کہ جیسے اپاہج ہیں ہم
اپنی ٹانگیں بھی اپنی نہیں
دست و بازو بھی بے زور سے ہیں
کسی اور کے ہیں
ہمیں ہر گھڑی جیسے دھڑکا لگا ہے

کہ بیباکیاں گھر سے لے کر نہ نکلے
تو کیسے چلیں گے
یہیں گر پڑیں گے

قیامت سے بڑھ کر قیامت تو یہ ہے
کہ ہم نے ابھی تک یہ سوچا نہیں
ہم سے بیباکیاں بھی اگر چھن گئیں
ہم نے اپنے ہی پاؤں سے چلنے کا کوئی قرینہ نہ سیکھا
تو گرنا ہی اپنا مقدر نہ ٹھہرے
زمانہ کسی کے لیے کب رُکا ہے ——— !

پاگل خانہ

وہ پاگل جو زنداں سے نکلیں
انہیں ساری دنیا ہی اک قید خانہ لگے
وہ وحشی جو تھک ہار کر گھر سے زنداں میں جائیں
تو زنداں کے پاگل سبھی رقص کرتے ہوئے
اس طرح خیر مقدم کو آگے بڑھیں
اور بھی ان کو پاگل بنائیں
وہ گھر ہو کہ زنداں
کہیں پاگلوں کی کمی تو نہیں ہے
کہ انساں نے خود اپنے ہاتھوں سے
اس شہد سی زندگی میں
چمن سے قفس تک
وبالِ نفس کا
ہوا و ہوس کا
عجب زہر گھولا ہُوا ہے
جو بادل ہے بے آب چھاگل ہے وہ بھی
یہاں جو مسیحا ہے پاگل ہے وہ بھی

عجائب گھر

کباڑی کی دکاں پر

کیسی کیسی خوبصورت، دلربا، نایاب چیزیں ہیں
قمیضوں، ٹائیوں، کوٹوں کی یوں بھرمار ہے ہر سُو

سفید اقوام کی تہذیب نے جیسے
بھرے بازار میں ڈیرے جمائے ہیں
کھلے ہیٹوں، قوی بوٹوں کا وہ طومار ہے جیسے
ہم اب تک اپنے آقاؤں کے سر سے سوچتے ہیں اور انہی کے بے حیا
قدموں سے چلتے ہیں

کباڑی کی دکاں پر
کتنی رونق ہے

یہاں بچے، جواں، بوڑھے
تھکے عاشق، حسیں محبوب اور حالات کی ماری ہوئی مائیں
گھروں کے اور وطن کے سب محاذوں کو
اکیلا چھوڑ کر ایسے چلی آئی ہیں
جیسے اس کھلے بازار میں رن پڑ رہا ہو
اور تھوڑا سا لہو تن پر لگا کر

اس شہادت گاہ سے ہو کر گزرنا، سب سے اوّل، سب سے اونچا
وقت کا زندہ تقاضا ہو

کتابوں کی دکاں پر
ہاٹ لٹریچر بہت ہے
جو چُھپی دنیا سے چلتا ہے
گٹر کی نو بہ نو خوشبو سمیٹے
سینہ در سینہ نئی نسلوں تک آتا ہے
سکولوں، کالجوں اور درس گاہوں میں
کتابیں تو بہت سی ہیں مگر اکثر کلاسیکی ہیں
ان کو کون دیکھے، ان خزانوں کو کھنگالے
سب نئی نسلیں تو ڈائجسٹوں پہ پلتی ہیں
رہیں میری کتابیں تو وہ تنہا بند صندوقوں میں
چُپ سادھے پڑی ہیں
اُن کو دیمک کے سوا کوئی نہیں پڑھتا
کباڑی کی دکاں بھی منتظر ہے
کب کتابوں کا محافظ
اس کے رستے سے ہٹے
اور وہ کسی ریڑھے پہ میری ان شہادت پانے والی سب کتابوں کو

شہادت گاہ میں لائے
انہیں پھر سے سجائے
اپنی پُرمایہ دکاں کی خوبصورت، دلربا، نایاب چیزوں میں
مگر میں مر نہیں سکتا
کہ میں صدیوں کی اس چکّی میں پِستا جا رہا ہوں
پھر بھی لکھتا جا رہا ہوں
اور زندہ ہوں

شہر آشوب

ہم کیسے آزاد ہیں
پہلے قفل لگے تھے ہونٹوں پر
لیکن اب دروازوں کو بھی قفل لگا کر سوتے ہیں

ہر سُو زرد وبا پھیلی ہے
کیسی دہشت گردی ہے
خوف کے پہریدار کھڑے ہیں گلی گلی کے ناکے پر
دیوانوں پر بند ہوئی ہے اب تو دشت نوردی بھی
سب سے بڑے اک دہشت گرد نے کیسی خبر پھیلائی ہے
ہمسائے نے ہمسائے سے ملنا جلنا چھوڑ دیا
بھائی بھائی کا دشمن ہے
خون ہی خون کا پیاسا ہے
ایسے خبر چلتی ہے جیسے یہ سب کھیل تماشا ہے
دہشت گرد نے گھر گھر میں یہ کیسی آگ لگائی ہے
خود وہ دہشت گرد ہے لیکن رکھوالا کہلاتا ہے
خود معصوم بنا بیٹھا ہے ہم کو جرم سکھاتا ہے
رستوں میں دیوار اٹھائی اس نے آہن آہن کی

بسنت چڑھے سب پرجا
یہی دعا ہے راجہ کاہن کی
روک رکھا ہے اُس نے وہ طوفان جو آنے والا ہے
کتنے مکر کے چہرے ہیں اُس کے مکریلے چہرے پر
ـــــ کیا اس کو معلوم نہیں
رُت بدلے تو جھوٹ کا سارا ملبہ
وقت سمندر میں بہہ جاتا ہے
کتنی سچی باتیں ایک ہی ریلے میں کہہ جاتا ہے ــــــ!

بددُعا

پہاڑوں سے جوگی اُتر کر
سوئے شہر آیا
تو دیکھا
کہ سب لوگ حسنِ بصارت سے محروم ہیں
ناک کی سیدھ پر چل رہے ہیں
اُس نے اک اک کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا
کسی کی زباں پر کسی حرف کا کوئی کتبہ نہیں تھا
کوئی بھی نہ بولا
اُس نے اِک اِک کو آواز دی
بند گنبد میں لیکن سماعت کا کوئی دریچہ نہیں تھا
اُس کی اپنی صدا جب سیہ رنگ گنبد سے ٹکرا کے پلٹی
تو کہنے لگی
کل یہاں وقت کے ایک منصور کو
عدل والوں نے سُولی پہ لٹکا دیا تھا
مگر شہر والے تماشائی بن کر اُسے دیکھتے تھے
کسی میں یہ ہمّت نہیں تھی

کہ منصور کا ہم نوا ہو
اُس کے ہونٹوں پہ کوئی صداقت کا لفظ ہو، کوئی سچا ہو
شہر والے اُسی دن سے سکتے میں ہیں
اُنہیں شہر کی بد دعا لگ گئی ہے
یہ اندھے ہیں
گونگے ہیں
بہرے ہیں
پتھر کے بت بن گئے ہیں

علامت کا چہرہ

علامت کی زباں میں
مَیں نے باتیں کیں
تو وہ کہنے لگا
الفاظ کتنے خوبصورت ہیں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا
کہ اتنے تہ بہ تہ رنگوں میں
کِس کی
تم نے یہ تصویر کھینچی ہے
میں حیراں تھا
کہ میری نظم میں
جس شخص کا ظاہر دکھائی دے رہا ہے
اُس کا باطن
اُس کی آنکھوں کو دکھائی کیوں نہیں دیتا !

علامت کا گھنا پردہ اٹھا کر
بر ملا جب مَیں نے
اک جلّاد چہرہ اُس کو دِکھلایا
تو وہ چیتے کی صورت زور سے دھاڑا
مرے سچ کی زباں ہی کھینچ لی اُس نے
جھپٹ کر بوٹی بوٹی کر دیا مجھ کو
لہو، میرے لہو کے تہ بہ تہ رنگوں میں چھپ کر
پھر علامت بن گیا ہے وہ
قیامت بن گیا ہے وہ

زرد سورج، کالی دُھوپ

اجالے میں مَیں نے عجب خواب دیکھا
کہ سر پر دہکتا ہُوا زرد سورج ہے
میدانِ محشر ہے اور دھوپ سے رستگاری کی خاطر
گنہگار خلقت کسی اور ساحر کی
بخشی ہوئی چھتریاں سر پہ تانے کھڑی ہے
دیکھتے دیکھتے زرد سورج کی رنگت سیہ پڑ گئی
روشنی بُجھ گئی، چھتریاں بند ہونے لگیں
اور گرمی کی شدّت فزوں ہو گئی

خوف کی گرم، اندھی، سیہ رات میں
خلقتِ بے اماں داورِ حشر کے سامنے سرنگوں ہو گئی
چار سو ہاتفِ غیب کی گونج اٹھی صدا
"اپنے سورج کی پھیلی ہوئی
نرم، شفاف، اجلی، چمکتی ہوئی دھوپ کے روپ کو بھول کر
دھوپ میں چھاؤں کا شامیانہ بنانے کی ناکام خواہش میں
جو دوسروں کی بنائی ہوئی کھوکھلی چھتریاں تان لیں
اُن کے سر سے کبھی خوف کی چھاؤں ٹلتی نہیں

زرد سورج اگر ڈھل بھی جائے
تو لاانتہا، بے سحر رات کی
وقت کے ریشے ریشے میں اتری ہوئی
اندھی، کالی، سیہ دھوپ ڈھلتی نہیں
صبحِ نو کی کوئی شاخ پھلتی نہیں"

نہ موت ہے نہ زندگی

لہو کا ورثہ

ہمیں جو اجداد سے ملا تھا

ہماری پہچان تھا

صداقت کے راستے پر اسے بہایا تو سرخرو تھے

اور آج ہم دل کے آئینے کو

خراش سے بھی بچا رہے ہیں

منافقت کی قبائیں اوڑھے

سجود میں گم

عمل سے عاری حیات کو اپنی ذات سے بھی چھپا رہے ہیں

— حرارتِ زندگی سے خالی لہو

ہمارے بدن کے ریشوں میں جم گیا ہے

یہ بھول بیٹھے

لہو کا ورثہ

ہمیں صداقت کا زرد چہرہ

نکھارنے کے لیے ملا تھا

صدا کا پرچم ابھارنے کے لیے ہلا تھا

اُسی کی اتنی بڑی سزا ہے
کہ کربلائے حیات سے
بھاگ جانے والوں سے
موت بھی دور بھاگتی ہے

کہانی ایک جیسی ہے

کہانی ایک جیسی ہے
فقط چہرے بدلتے ہیں
اگر کچھ فرق ہے تو صرف آوازوں کا ہے
کردار ورنہ ایک جیسے ہیں

ہم ان چہروں میں آوازوں میں
اپنے آپ کو پہچان سکتے ہیں
مگر یہ کھوج یہ پہچان ہی تو سخت مشکل ہے
اگر آئینہ بھی دیکھیں
تو پیشِ آئینہ ہی دیکھتے ہیں ہم
پسِ آئینہ جو چہرے ہیں
اُن کو دیکھنے کی کس میں ہمّت ہے!

یہی تو بات ہے
ہم لوگ اپنے آپ کو بھی جانتے کم ہیں
اگر ہم جان بھی جائیں

تو پھر پہچانتے کم ہیں
اسی میں عافیت اپنی ہے
اپنی رستگاری ہے
کہ اپنے روبرو ہونے کا حاصل
شرمساری ہے
مگر کب تک یوں ہی بے زار و شرمندہ رہیں گے ہم!
یہی حالت رہی تو تابکے زندہ رہیں گے ہم!

اصحابِ کہف

عجیب نشہ تھا عظمتوں کا
چلے تھے گھر سے کہ ساری دنیا کو زیر کرلیں
جہاں کی دولت سمیٹ لیں، جھولیوں میں بھر لیں
ہمیں تھا اپنے نئے تمدن کی برتری پر غرور اتنا
سمجھ رہے تھے کہ ساری دنیا کی سلطنت اپنی راہ میں ہے
وہ زور اپنی نگاہ میں ہے
کہ جو بھی اپنے مقابل آئے، پناہ مانگے
کچھ اتنا احساسِ برتری تھا
کہ اس نشے ہی میں سو گئے ہم

عجیب عالم تھا غفلتوں کا
ہم اپنے خوابوں کی لذتوں میں
کچھ اتنے ڈوبے کہ پھر نہ ابھرے

ہمارے سر سے ہزاروں صدیاں گزر گئیں
پھر بھی ہم نہ جاگے
شباہتیں گم ہوئیں ہماری
شناختیں اپنی بھول بیٹھے
پھر ایک دن
نیند کی چٹانوں کو توڑتے زلزلے سے آنکھیں کھلیں ہماری
تو ہم نے دیکھا
ہمارے سورج کی دھوپ سائے میں ڈھل چکی تھی
ہماری جیبوں میں کھوٹے سکّے تھے
ساری دنیا بدل چکی تھی

مری قبائے سخن

تری ادا کی طرح کج نہیں ادائے سخن
تری وفا سے تو اچھی ہے یہ قبائے سخن
چھپائے رکھتی ہے یہ میرے تن کی عریانی
نہ تو کہ شکل بھی جس نے نہ میری پہچانی
پڑی ہیں اس پہ ترے غم کی سلوٹیں کتنی
چھپی ہیں اس میں مرے دل کی دھڑکنیں کتنی
مرے خلوص کی گرمی، ترے بدن کا لہو
اسی میں دفن ہے وہ شعلۂ قد و گیسو
یہ اس کا رنگ کہ ہو جیسے خاک کی صورت
یہ اس کا چاک مرے قلبِ چاک کی صورت
وہ رنگ جس میں لہو میرے سبزہ زاروں کا
وہ چاک، درد ہے جس میں تمام پیاروں کا
زمانہ روٹھے مگر یہ خفا نہیں ہوتی
یہ میرے دل، مرے تن سے جدا نہیں ہوتی
تری وفا سے تو اچھی ہے یہ قبائے سخن
تری ادا کی طرح کج نہیں ادائے سخن

چہرہ

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے
سب بیتے دن گہری نیند میں
سوتے سوتے دل دھڑکن کے
اک جھٹکے سے جاگ اٹھتے ہیں
آنکھیں مَلتے مَلتے مجھ سے
کہتے ہیں ـــــ ہم کو پہچانو
ہم ہیں تمہارے ہی آئینے
ان میں اپنا چہرہ دیکھو
اُجلا اُجلا روشن چہرہ
حال کے اس نقطے پر آ کر
کتنے چاند اور کتنے سورج
اس چہرے سے جھانک رہے ہیں
دھیمے دھیمے سے لہجے میں
اک دوجے سے یہ کہتے ہیں
اس چہرے پر رخشاں رخشاں
ساری دنیا کا چہرہ ہے
وقت کے ماتھے کا سہرا ہے

سلطنت

زمانے کو ایسی ہوا لگ گئی ہے
کہ وہ دوست بھی جن سے برسوں کی یاری ہے
جن کی محبت مجھے جاں سے پیاری ہے
جب بھی مرے شہر آتے ہیں
اُن سے ملاقات ہوتی ہے لیکن بڑے ہوٹلوں میں
کہ تپتے ہوئے موسموں میں
وہاں نرم کولر کی ٹھنڈی ہوا ہے
لرزتی ہوئی سردیوں میں
وہاں تیز ہیٹر کی گرمی بہت ہے
مگر میرے کچھ یار دلدار ایسے بھی ہیں
جو بدلتے دلوں کے اس آشوب میں بھی
مرے شہر میں جب بھی خوشبو کے جھونکے کی مانند اُتریں
مرے دل پہ دستک سی ہوتی ہے جیسے
مرے گھر کا دروازہ برسوں سے اُن کے لیے ہی کھلا ہے
کوئی بھائی کہہ کر بلاتا ہے مجھ کو
کوئی میرا عاشق، مری جان، کہہ کر مناتا ہے مجھ کو

مجھے ایسا لگتا ہے
ان دوستوں کے دلوں میں وہ گرمی ہے
جو میرے یخ بستہ گھر کو
محبّت کی حدّت سے دہکا رہی ہے

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
اِن کی نگاہوں میں ایسی خنک روشنی ہے
جو چاہت کی شدّت کو، گھر کی مسرّت
مسرّت کو پاکیزہ فرحت میں تبدیل کرتی چلی جا رہی ہے
کہ گھر ہی تو وہ استعارہ ہے جس میں
بہاروں کی خوشبو ہے
یاروں کا جادُو ہے
اپنوں کی چاہت ہے
غیروں کی قدغن نہیں ہے
جہاں حکمرانی ہے دل کی
جہاں ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے ہیں
کہ گھر سے بڑی سلطنت اور کوئی نہیں
اور دل سے بڑا کوئی بھی فن نہیں ہے

روشن لفظوں کا لہو

خون میں ہیں تربتر لفظوں کے چاند
کون پڑھ سکتا ہے اس تحریر کو
جب تک انسانوں کا خوابیدہ ضمیر
ایک گہرے گھاؤ سے پرخوں نہ ہو
جانے کب بولے گا یہ روشن لہو
جو امانت ہے کھلے اوراق پر
اس طرح رکھا ہُوا ہے طاق پر
منتظر ہے جیسے اس طوفان کا
جب کھُلے گی یوں عدالت راہ میں
لفظ بولیں گے شہادت گاہ میں
جب کھرا کھوٹا جدا ہو جائے گا
کالے لفظوں کی اندھیری رات کا
ختم سارا سلسلہ ہو جائے گا
روشنی کے لفظ جی اٹھیں گے پھر
اور ایسے دُھل کے نکلے گی فضا
تا ابد پھر خوں نہ ہو گا لفظ کا
جگمگا اٹھیں گے یہ ارض و سما

گنجینۂ اظہار

میں اپنی ذات کے مرکز سے کٹ نہیں سکتا
ہے کائنات بھی میری حیات کا محور
مرے لیے تو برابر ہیں انفس و آفاق
مرے وجود میں ہے انعکاس دونوں کا
اسی وصال سے اک پیکرِ جمال ہوں میں
وہ کوئی جوہرِ معلوم ہو کہ نا معلوم
سبھی کا عطر ہوں مَیں نقطۂ کمال ہوں مَیں
اسی سے مجھ کو میسّر ہے جودتِ اظہار
یہ گردِ پیش ہیں ورنہ تمام گرد و غبار
مرے وجود سے انکار ہو نہیں سکتا
ہو کائنات کی کتنی عظیم دانائی
مری ہی روح کا اک لازوال حصّہ ہے
وہ لاکھ چاہے کہ ہو منکشف مگر اس کا
مرے بغیر تو اظہار ہو نہیں سکتا
ہے کائنات مری ذات کی امانت بھی
جو حسن بھی ہے، محبت بھی ہے، صداقت بھی

سات نمبر کی بس

(منظور عارف کی یاد میں)

یہ مری ہم نفس
سات نمبر کی بس
لے کے جاتی تھی جو
گھر سے دفتر تجھے
جس میں آتا تھا تو
روز دفتر سے گھر
کف اڑاتی ہوئی
ڈگمگاتی ہوئی
شاہراہوں پہ وہ چیختی پھر رہی ہے مگر
تو کہیں گھر میں ہے
اور نہ دفتر میں ہے
تُو تو آفاق کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا
تُو بہت تھک گیا تھا
زمیں کی ہری گود میں سو گیا

تیری پگلی تجھے
آج بھی ڈھونڈتی پھر رہی ہے وہاں
تیرے قدموں کے روشن ہیں جن راستوں پر نشاں
اور کیا اُس کی ہے دسترس
یہ مری، ہم نفس
سات نمبر کی بس

بھکارن کا گیت

اور بھی کام ہیں میرے رب کو
وہ روزی دیتا ہے سب کو
میری دعائیں لے جا بابا
اُس کے نام پہ دے جا بابا
جس نے یہ دن رات بنائے
چاند تراشے، پھول کھلائے
دنیا تو عبرت کی جا ہے
میں ہوں اپاہج بھی تو کیا ہے
وہ حاکم ہے، وہ ہے داتا
تو نے کبھی سوچا بھی بابا
کیا میری کیا تیری سج دھج
میں بھی اپاہج تُو بھی اپاہج
میں مانگوں تُو موج اڑائے
کوئی کام کرے تُو کھائے
کوئی بابل اور نہ میّا
نا بھیّا نا کوئی کھویا

کوئی نہ ڈولی لینے آیا
مجھ سے بھاگے میرا سایا
کون سُنے کس کے گھر جاؤں
بھیک نہ مانگوں تو کیا کھاؤں
تھوڑی مٹی اور لگاتا
سب کا مالک، سب کا داتا
تو میں یوں نہ اپاہج ہوتی
میری بھی کچھ سج دھج ہوتی
دونوں جہانوں کا وہ رب ہے
لیکن اُس کو فرصت کب ہے
دن اور رات کے جال بُنے وہ
کیوں میری فریاد سُنے وہ
اور بھی کام ہیں میرے رب کو
وہ روزی دیتا ہے سب کو
میری دعائیں لے جا بابا
اُس کے نام پہ دے جا بابا

ہر گھر میں اک پاگل لڑکی

ہر گھر اک بندی خانہ ہے
ماں کے طعنے سہتے سہتے
باپ کے جبر میں رہتے رہتے
بھائی کی خدمت کرتے کرتے
چُپ چُپ چُپ چُپ ڈرتے ڈرتے
ہر گھر میں اک پاگل لڑکی
سب کی نظروں سے چھپ چھپ کر
کس کی یاد میں کھو جاتی ہے!
کیوں دن بھر کے کام سے تھک کر
وہ کھڑکی میں آ جاتی ہے
اور اک دیا جلا جاتی ہے
اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے
ہنستے ہنستے، روتے روتے
ہر گھر میں اک پاگل لڑکی
کس کا رستہ تکتے تکتے
سچ مچ پاگل ہو جاتی ہے!

انارکلی

جو آنکھوں میں سمایا تھا
دھڑکتے دل کو جس نے گدگدایا تھا
محبت کا وہ پیارا خواب تھا کیسا ـــــــ!
کہ جیتے جی کسی دیوار کے زنداں میں چنوایا گیا اُس کو
عجب اندازِ محبوبی سے دفنایا گیا اُس کو
مگر جب اُس کی چیخیں تھم گئیں،
دیوار میں سوئی محبت ایک افسانہ بنی
تو پھر نئے افسانوی انداز سے
دلہن بنا کر
اِس بھرے بازار میں لایا گیا اُس کو
اُسے رُسوا کیا تھا کل محبت کرنے والوں نے
کلی سے جسم کو ہیروں میں رکھ کر تولتے ہیں
آج بھی بے فکر شہزادے
وہ کل بھی ناچنے والی طوائف تھی

نمائش گاہ میں رکھی ہوئی
وہ آج بھی چینی کی گڑیا ہے
اسی بازار میں ہر روز وہ بکتی ہے
اس کے جسم کا نیلام ہوتا ہے
مگر اپنی حکومت کے نشے میں چُور شہزادہ
محبت کے چلن سے بے خبر ہے
اور گہری نیند سوتا ہے

مُورتی

دیکھ کر تجھ کو ایسا لگتا تھا
تُو بھی پتھر کی مورتی ہے کوئی
دیو مالا کا جاگتا کردار
دیوتاؤں نے اپنے ہاتھوں سے
ایک پیکر میں جس کو ڈھال دیا
حُسن کی ایک بولتی تصویر
ایک شہکار وہ بھی چاہت کا
جو بھی دیکھے وہ دیکھتا رہ جائے

مَیں کہ شاعر ہوں دل بھی رکھتا ہوں
تجربہ میرا مختلف نکلا
تجھ کو چاہا تو یوں ہُوا محسوس
تیرے پیکر میں جان تو ہے مگر

آج بھی تیرا دل ہے پتّھر کا
اور پتھر سے مجھ کو کیا لینا!

تُو نے شاعر کا نرم و نازک دل
اپنے پتھریلے پن سے توڑ دیا
پھر بھی شاعر نے تیرا دل رکھا
لا کے مندر میں تجھ کو چھوڑ دیا

ممتا کا دُکھ

مائیں سب پاگل ہوتی ہیں
کم سن بچے
اُن کے خوابوں کے شہزادے
ماں کی لوری سُنتے سُنتے
کلیاں کانٹے چُنتے چُنتے
جب سچ مچ شہزادے بن جاتے ہیں
لال پری کی دھن میں اکثر
قریہ قریہ، وادی وادی، صحرا صحرا کھو جاتے ہیں
کتنے ہی کڑیل، جی دار، جیالے
دشمن کے دھوکے میں آکر
جنگ کا ایندھن ہو جاتے ہیں
مائیں، پیاری مائیں
گھر گھر کی دہلیز پہ بیٹھی
اُن کا رستہ تکتی ہیں
روتی ہیں
مائیں سب پاگل ہوتی ہیں

ایک کردار

اُس کے اندر بھی خلا ہے اور باہر بھی خلا
وہ ہے ایسا شخص جیسے آئینہ ٹوٹا ہُوا

وہ ہے اک سوکھا شجر خالی تری چھاگل، ہَوا
چھیڑتی ہے کس لیے آکر اُسے پاگل، ہَوا

ایک مدت سے وہ چپ ہے اور اس کے ہونٹ بند
آ بھی جاتا ہے کبھی اس کے لبوں پر زہر خند

عمر بھر سب کچھ سُنا کچھ بھی نہیں اُس نے کہا
وہ لُٹا ہے یوں کہ جیسے اک زمانہ لُٹ گیا

چوٹیوں نے زخم جو اُس کو دئیے سہتا رہا
کہساروں میں بھی ندی کی طرح بہتا رہا

ساری قدریں پائمال اور اُس کا دل بھی پائمال
لیکن اس پت جھڑ میں اُس کے غم کا موسم لازوال

کشتیٔ ساحل نما ہے یوں تو بے پتوار ہے
وقت کی کٹ پتلیوں میں وہ عجب کردار ہے

چھتنار

وہ اک پیڑ، وہ اک اکیلا شجر
کتنا تن کر کھڑا ہے
مگر اپنی تنہائی کی دھوپ میں
سوکھتا جا رہا ہے

تعجب ہے
شہرِ شجر سے کوئی بھی پرندہ
اکیلے شجر کی طرف اُڑ کے جاتا نہیں ہے
اُسے اپنی آبادیوں کی کہانی سناتا نہیں ہے

اکیلا شجر
آپ اپنے لیے
اک تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی ہے
اپنے شہرِ شجر کی خود آرائیوں پر
وہ اک مستقل طنز ہے
یوں تو باہر سے تن کر کھڑا ہے

مگر اپنے اندر کی بربادیوں کے تصور سے بے حال ہے
ٹوٹتا پھوٹتا جا رہا ہے
— اکیلا شجر ایک دن ٹوٹ کر گر پڑے گا
تو کم ظرف شہرِ شجر کو یہ احساس ہوگا
اکیلا شجر سارے شہرِ شجر کے لیے
ایک چھتنار تھا
اور اب وہ کہیں بھی نہیں ہے
مگر اُس کی تنہائی کی دھوپ سے
سارا شہرِ شجر جل رہا ہے

اعزاز

موت برحق ہے
یہ زندگی بھی صداقت ہے
کس کیلئے تم نے انمول جاں کی یہ بے مول قیمت ادا کی !
تم تو زندہ رہے زندگی اور زندہ دلی کے لیے
عمر بھر قہقہے سب میں تقسیم کرتے رہے
زندگی کے سبھی زخم ان چاہتوں سے مہکتے ، چہکتے چھلکتے ہوئے
قہقہوں ہی کے مرہم سے بھرتے رہے
روح میں زینہ زینہ اُترتی ہوئی
روشنی کے لیے ، آگہی کے لیے
کیا تمہیں روشنی مِل گئی ، آگہی مِل گئی
جس کے عرفان میں ڈوب کر
مسکراتی ہوئی زندگی کو
ہمکتی ہوئی موت کے روبرو کر دیا !
میں کو تو کر دیا !
جتنے بھی رنگ ہیں
ایک ہی رنگ میں ڈھل گئے

آج کثرت ہے وحدت میں گُم
کل یہ وحدت
ہزاروں شگوفوں میں کھلتی ہوئی پھر نظر آئے گی
تم بھی لوٹ آؤ گے
زندگی کی صداقت بھی لوٹ آئے گی
تم نے تکمیلِ فن کی طرح
جس کی حرمت کے اعزاز میں
اپنی انمول جاں کی یہ بے مول قیمت ادا کی
مسکراتے ہوئے موت کو بھی گلے سے لگایا
بے وفا زندگی سے بھی تم نے وفا کی

شخص و عکس

وہ عجیب طور کا شخص تھا
جو کسی کے ہاتھ بکا نہیں
جو کسی کے در پہ جھکا نہیں
جو زمانے بھر سے امیر تھا
مگر اتنا دل کا فقیر تھا
کہ تمام دھن کہ تمام فن
کبھی دوستوں میں لٹا دیا
کبھی دشمنوں میں گنوا دیا
مگر اس کے دل میں جو ہیر تھی
وہی زندگی کا ضمیر تھی
وہ اسی کے حسن و جمال پر
تھا فریفتہ بھی تباہ بھی
کہ تھی اُس کو موت کی چاہ بھی

وہ اسی کی دھن میں تلاش میں
کہیں دُور ـــــ دُور نکل گیا
کہ وہ ایک تیر تھا چل گیا
وہ تو رانجھنا، وہ تو ایک تھا
مگر اس کے سارے وجود میں
کسی ایک اور کا عکس تھا
وہ عجیب طور کا شخص تھا

کیمیاگر

عجب اُس کی باتوں کا جادو تھا
میں جس کی خوشبو میں تحلیل ہو کر
بہر سُو بکھرتا چلا جا رہا ہوں
عجب اُس کی آنکھوں میں دانائی تھی
جس کی پہنائی میں ڈوب کر بھی
افق تا افق میں ابھرتا چلا جا رہا ہوں
عجب اُس کے قدموں کی وقت آشنا آہٹیں تھیں
کہ میں جن کی گمبھیرتا
اپنے دل اپنے دامن میں بھرتا چلا جا رہا ہوں
عجب اُس کے احساس کی وسعتیں تھیں
کہ میں اُس کے سینے کی سب دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر
نکھرتا، سنورتا چلا جا رہا ہوں
عجب کیمیا گر تھا وہ
جس نے مٹی کو سونا بنایا
مرے دل میں اپنی محبت کا ایسا الاؤ جلایا
کہ آج اُس الاؤ کے چاروں طرف

آنے والوں کا میلہ لگا ہے
کہ جن کے دہکتے ہوئے سرخ و شاداب چہروں پہ
اُس کیمیا گر کے زرتاب چہرے کا بکھرا ہُوا نور ہے
پیکرِ شب بھی اس روشنی سے شرابور ہے
یہ عجب رتجگا ہے

مجسّمہ

زندگی عجائب گھر
جس کے گوشے گوشے میں
بے شمار تصویریں
ایک ایک سے بڑھ کر
دل نواز ، لاثانی
سب کے درمیاں لیکن
اک مجسّمہ بُدھ کا
ہڈیوں کا اک پیکر
ساکت اور صامت سا
دل کو کھینچ لیتا ہے
اس کے سرد ہونٹوں پر
گرم مسکراہٹ سی
منجمد ہے دل لیکن
اس میں ایک آہٹ سی
نیم بند آنکھوں سے
جھانکتی ہے حیرانی

ایک مطلعِ تاباں
زرد زرد پیشانی
ٹوٹتی رگوں میں بھی
خون ہو رواں جیسے
ریت سے جیسے پاؤں پر
خم ہو آسماں جیسے
وہ جو سب کے کام آئے
اُس میں شانتی کتنی ــــ!
پُر سکون چہرے پر
دِل کی روشنی کتنی
روشنی کے دریا میں
وقت کی روانی بھی
زندگی کا عرفاں بھی
موت کی کہانی بھی

روشن ضمیر

نہ یہ سمجھو مری آنکھیں نہیں
میں دیکھ سکتا ہوں
مری پانچوں حسّیں بیدار ہیں
ٹھنڈی زمیں کا لمس
سورج کی کرن
خوشبو کا جھونکا
چہچہے اُڑتے پرندوں کے
یہ دنیا بھر کی ساری نعمتیں
سب ذائقے ہیں میرے ہونے کے
یہ چھٹی حس
مری آنکھوں کی ایسی روشنی ہے
جس کو سارے عقل کے اندھے بھی
مل کر غرق کر سکتے نہیں
کارِ ہوس کے بحرِ ظلمت میں
مری روشن ضمیری
روشنی کا وہ سمندر ہے

کہ جس کا لہریا پانی بہت میٹھا ہے
جس کو پی کے دل کی جنّتیں آباد ہوتی ہیں
مرے پاس آؤ
میرے رُوبرو بیٹھو
مری روشن ضمیری کی نگاہوں سے ذرا دیکھو
کہ تم پر بھید کھل جائیں زمانوں کے
مکانوں، لامکانوں کے
تمہیں معلوم ہو جائے
کہ دل کی روشنی ہی زندگی کا اسمِ اعظم ہے

صبا رفتار

وہ ہمارے عہد کا استاد ہے
دوپہر ہو شام ہو
دستکیں دیتا ہے وہ اونچے گھروں کے پھاٹکوں پر
جن گھروں کا کوئی دروازہ نہ دل
لیکن اُس کا کام اتنا مستقل
کوئی ناغہ، کوئی وقفہ اُس کی قسمت میں نہیں

فرصتوں کا لطفِ بے پایاں
محبت میں تو ہے لیکن ضرورت میں نہیں
اُس کی مجبوری
کہ کوئی شہر آزاداں کا حاتم
اُس کے اندھے علم کے طوطے کو چوگا ڈال دے
اُس کو زر دے، مال دے
اُس کی خواہش
اُس کا بھی شاہوں، رئیسوں، حاکموں میں نام ہو
اُس کو اس سے کیا غرض
اِس کاروبارِ علم میں وہ نیک یا بدنام ہو

اُس کے استادوں کے نیچے تو زمیں کا بوریا تھا
اور اُوپر آسماں کی شال تھی
کیا یہ کم ہے
اُس کے نیچے سات فٹ کی کالی قبر ہے
وہ سبک رفتار ہے ــــــ!

سدا بہار

بیری پر جب بیر آتے ہیں
بچے بالے پتھر لے کر
زور زور سے پتھر پتھر مار مار کے
بیری کو زخمی کرتے ہیں
بیری پتھر کھا کھا کر بھی
زور زور سے ہنستی ہے
اور اپنے میٹھے میٹھے پھل سے
سب بچوں کی خالی جھولیاں بھر دیتی ہے
بچے اپنی جھولیاں بھر کر
رات کی گود میں سو جاتے ہیں
آنے والی کل کی کھوج میں کھو جاتے ہیں
بیری اپنے دکھتے بازو سہلاتی ہے
ویراں جسم پہ آنے والے موسم کے پیوند لگا کر
دامن میں پھر تازہ خوشے بھر لاتی ہے

ہر موسم میں زخم پہ زخم سجا کر بھی وہ
آنے والی نسلوں سے کہتی ہے
'آؤ مجھ کو پتھر مارو
میرے سب پھل پھول اتارو
کل جو کیا تھا آج بھی کر لو
اپنی خالی جیبیں، پھیلے دامن بھر لو'

خانہ بدوش

ہم وہ خانہ بدوش لوگ ہیں جو
خیمۂ فکر وفن میں رہتے ہیں
جو ہماری زباں پہ آتا ہے
دل کی گہرائیوں سے کہتے ہیں

ہر کسی کی ہے اپنی سچائی
بات جو جس کے دل کو بھا جائے
یہ ضروری نہیں کہ بات اپنی
ہر کسی کو پسند آ جائے

اپنی ساری صداقتوں کے گلاب
آج کی وادیوں میں ملتے ہیں
ان میں خوشبو ہے روحِ عصر کی بھی
یہ ہر اک سرزمیں پہ کھلتے ہیں

ہم کہ ہیں فکر و فن کے بنجارے
سب زمانوں کا [illegible] پیتے ہیں
اب یہاں ہیں تو کل وہاں ہوں گے
پھر بھی ہم سب کے دل میں بستے ہیں

بابا لوگ

اس بستی میں
کیسے کیسے بابا لوگ تھے جو نایاب ہوئے ہیں
اُن کی شکلیں، ان کے چہرے
یوں تو مٹی کے سینے میں دفن ہیں
لیکن یوں لگتا ہے
تیرے میرے چہروں پر لکھے ہیں
اُن کی باتیں ، اُن کی خوشبو
مٹی کے سینے سے نکل کر
گلیوں گلیوں پھیل رہی ہے
شہر کی مسجد، گاؤں کی چوپال پہ دیکھو
آج بھی وہ بیٹھے ہیں
اور اپنی باتوں کے نور سے
چاروں جانب پھیلی تاریکی کا سینہ چیر رہے ہیں
نسلیں، آنے والی نسلیں

اُن کی جانب دیکھ رہی ہیں
اپنی جانب دیکھ رہی ہیں
اُن میں اِن میں فرق ہی کیا ہے
وہ ماضی یہ حال کے بابا لوگ ہیں
سب کو پیار کی شیرینی دیتے ہیں
سب کا دکھ اپنی جھولی میں بھر کر
سب کو سکھ کی
ایک مسلسل اور بے پایاں سکھ کی
سورج جیسی گرم اور دھرتی جیسی نرم بشارت
بانٹ دیا کرتے ہیں
آج کے بچّے جو اِن کے قدموں میں بیٹھے
اِن کی باتیں، اِن کی خوشبو، سونگھ رہے ہیں
کل کے بابا لوگ ہیں
تیرا میرا مستقبل ہیں
ماضی، حال اور مستقبل سب ایک ہیں
وقت تسلسل میں بہتا ہے
جانے والے جاتے ہیں پھر آجاتے ہیں
اپنی مٹی لے جاتے ہیں
اپنی خوشبو دے جاتے ہیں

وقت ، ہوا اور خوشبو جاگ رہی ہے
کیسے کیسے بابا لوگ تھے
جن کے دل میں روشن
ایک مقدّس آگ رہی ہے

عجب یہ لگن ہے

تو اک چاند تھا
اور ستارے ترے گرد ہالہ بنائے ہوئے
تجھ سے سرگوشیاں کر رہے تھے
عجب تیرے چہرے پہ معصومیت تھی
عجب تیرے لہجے میں محبوبیت تھی
کوئی تیرے چہرے کی معصومیت میں
کوئی تیرے لہجے کی محبوبیت کے سمندر میں غرقاب تھا
خود کو بھولا ہُوا تھا

پھر ایک ایک کر کے ستارے سبھی رخصت ہوئے
چاند بھی ڈوب جانے لگا
اک ستارہ جو اس چاند کی روشنی سے
ضیا تاب تھا، مضطرب تھا
عجب والہانہ سے انداز میں
چاند کو چوم کر اُس سے رخصت ہُوا
—— چاند افق سے اُدھر جا چکا ہے

ستارہ اِدھر شام، ہر شام اس کو بلاتا ہے

لیکن وہ چاند اس کا چاند

آج تک مُڑ کے آیا نہیں ہے

ستارے نے اُس کو بھلایا نہیں ہے

اُس کے ہاتھوں کا مَس، اُس کے چہرے کا رس

آج بھی اُس اکیلے ستارے کے ہونٹوں پہ ہے

چاند کے نرم لہجے کی محبوبیت

اُس کی باتوں میں ہے

چاند کے قرب کی ساری حدّت

ابھی تک اکیلے ستارے کی سانسوں میں ہے

— عجب یہ لگن ہے

ستارہ بھی اب چاند بننے کی دھن میں مگن ہے

درخت یہ کھجور کا

مرا رفیق و رہنما
درخت یہ کھجور کا
بڑھا ہے میرے سامنے
کھڑا ہے میرے سامنے
یہ مستقل مزاج بھی
یہ کل بھی تھا ہے آج بھی
ہزار آندھیاں چلیں
فضا میں بجلیاں پلیں
یہ عہد توڑتا نہیں
جڑوں کو چھوڑتا نہیں
جڑوں سے اس کی یہ وفا
ہے دلنواز و دلربا
یہ پیڑ ہے مٹھاس کا
علاج میری پیاس کا
یہ شاخ شاخ رقص میں
ہے کون اس کے عکس میں

جو میرا ہمنوا بھی ہے
جو دل کی یہ صدا بھی ہے
خلوص میں مہک بھی ہو
مزاج میں لچک بھی ہو
جو واقفِ نمو رہے
بلند و سرخرو رہے
تو پیڑ ٹوٹتا نہیں
تو ساتھ چھوٹتا نہیں
مٹھاس میرا نام ہے
یہ تحفۂ دوام ہے ——،

ہمزاد سے گفتگو

تیری دریا دلی ہیں ہے پیارے
تُند جذبات کا تلاطم بھی
ہے خوشی تو بہت ہی دُور کی بات
تیرا اپنا نہیں ترا غم بھی

دل ترے پاس ہے دماغ بھی ہے
نُور بھی اور شعور بھی تیرا
پھر بھی دونوں میں فاصلہ اتنا
جیسے دریا کے دو کنارے ہوں
تُو سمجھتا ہے دو کناروں میں
ہے وصالِ دوام ناممکن
میں یہ کہتا ہوں دو کناروں نے
کس توازن سے شورِ دریا کو
ایک آہنگ میں سمیٹ لیا

جب تری زندگی کا نور و شعور

خون بن کر تری رگ و پے میں
ایک آہنگ سے رواں ہو گا
تیری دریا دلی کی وسعت میں
اتنی گہرائی تہ بہ تہ ہو گی
جس کے سانچے میں ڈھل کے نکلے گا
تیرے جذبات کا تلاطم بھی
گھپ اندھیرے میں روشنی بن کر
لہر در لہر پھیل جائے گا
تیرے ہونٹوں کا یہ تبسم بھی

تتلیوں کے تعاقب میں

ازل سے تھا تتلیاں پکڑنے کا شوق اُس کو
وہ جنگلوں کا غزال، باغوں کا شہزادہ
وہ تتلیوں سے حسین تر تھا، اسی لیے تو
ہزار رنگوں کی تتلیاں اُڑ کے آپ ہی اُس کے پاس آئیں
وہ اُن کے رنگوں سے کھیلتا
اور اُن کے نازک پروں کو چٹکی میں پیس کر یوں ہوا کے رخ پر بکھیر دیتا
کہ جیسے قوسِ قزح کا سُرمہ فضا میں تحلیل ہو رہا ہو

وہ تتلیوں سے چلا تھا اور لڑکیوں تک آیا
جمیل، سادہ، لطیف، معصوم لڑکیاں
اُس کی ہم سبق بھی تھیں، ہم سفر بھی
وہ جنگلوں کا غزال، باغوں کا شاہزادہ
یہ سوچتا تھا
کہ تتلیوں کو زباں ملے تو وہ لڑکیوں کے ہزار پیکر تراش لیتی ہیں
اور رنگوں کی اوٹ سے یوں پکارتی ہیں
'کہ آؤ ہم کو شکار کر لو
کہ آؤ ہم کو شکار کر لو،

وہ جنگلوں کا غزال ، باغوں کا شاہزادہ
سُلگتے شہروں میں گھومنے والا وہ شکاری
بدن بدن کی مسافتوں میں کچھ ایسا کھویا
گلاب جسموں ، سراب ہونٹوں ، شراب آنکھوں میں ایسا ڈوبا
کہ پھر نہ اُبھرا
ابد کی ساعت قریب آئی
تو اُس کی آنکھوں کے سامنے ایسی دھند چھائی
کہ تتلیاں اور لڑکیاں
ایک دوسرے میں گھتی ہوئی جیسے رقص میں ہوں
کہ جس طرح عکس عکس میں ہوں
مگر وہ اتنا نحیف اتنا شکست خوردہ
کہ مشکلوں سے اگر کبھی اپنا ہاتھ اٹھائے
سوائے احساس نامرادی نہ اور کچھ اُس کے ہاتھ آئے
نہ جان نکلے نہ عکس ہی شخص میں سمائے
اور اُس کے چاروں طرف
دھنک رنگ تتلیوں کے پروں کا سرمہ
بدن بدن سے پھسلتا آنچل
اُڑے اور اُس کی ہنسی اُڑائے

پیشوائی

(عمر ہانیل کے لیے ایک نظم)

کیسی تھکن تھی نیند تھی کیسی
تو جس کی آغوش میں جا کر
سوتے سوتے سو ہی گیا ہے
کس کو خبر ہے نیند سے پہلے
کتنے پیاروں، دلداروں کو
کتنے یاروں، غم خواروں کو
تو نے پیار سے ہولے ہولے
آخری بار پکارا ہو گا
لیکن تو خود اٹھ کر جائے
میٹھی نیند سے اُن کو جگائے
اُن کو اپنا درد بتائے
اُن کو ساری رات جگائے

تُو نے یہ کب سوچا ہو گا
تُو نے یہ کب چاہا ہو گا
— وہ جو سب تیرے اپنے تھے
وہ تو سب تیرے سپنے تھے
وہ تو تیرے ساتھ ہی ہوں گے
گہری نیند میں جاکر بھی تُو
سرگوشی کے پیرائے میں
اُن سے باتیں کرتا ہو گا
— سوتے سوتے خواب سے تیری
جس وادی میں آنکھ کھلے گی
اُس وادی میں نور بہت ہے
نور خدا کا ، نور نبیؐ کا
جو تیرا ایمان تھا پہلے
لیکن اب پہچان ہے تیری
— تو نے نیند سے پہلے پہلے
ایسا توشہ ساتھ رکھا ہے
اِس دنیا میں ، اُس دنیا میں
سب کے دل میں سب کی زباں پر
جس کی چاہت کا چرچا ہے

یہ چاہت انمول ہے تیری
پیار کی خوشبو کب مرتی ہے
نقش ترے سب پائندہ ہیں
تیرے بعد بھی یہ زندہ ہیں
مر کر بھی تیرے چہرے پر
نورِ ابد کا لہرایا ہے
یہ تجھ کو لینے آیا ہے

دل دریا ہے

دل دریا ہے
آنکھیں اس دریا کے دو معصوم کنارے
جن کو دل دریا کی موجیں چُومیں
اِن کے سینوں کو سیراب کریں
اور ان کے اُوپر آرزوؤں کے شہر بسائیں
آرزوؤں کے شہر کہ جن پر
میری خوشی کے، میرے غم کے بادل چھلکیں
بادل چھلکیں جن کے اک اک چمکیلے موتی میں
میرے یاروں، میرے پیاروں، میرے دلداروں کے کتنے چہرے جھلکیں
چہرے جھلکیں، جن کے اک اک رنگ میں
میری ساری عمر کی کتنی تصویریں ہیں، تنویریں ہیں
تنویریں ہیں جن کے پاؤں میں
وقت کی کتنی زنجیریں ہیں

دل دریا ہے
دریا کب رکتا ہے
لہر لہر کی کاٹ کاٹ سے

وقت کی سب زنجیریں کاٹ رہا ہے
سب زنجیریں کٹ جائیں گی

دل کا دریا بہتے بہتے
وقت سمندر سے یوں مل جائے گا

آپ سمندر بن جائے گا
میرا ہو کر بھی یہ دل کا دریا
میرے ہاتھ نہیں آئے گا

تن کے خواب ادھورے

خواب نگر سے جھولی بھرنے
میں نکلا ہوں گھر سے
وہ صورت مرے ہاتھ نہ آئے
جس کو جیوڑا ترسے

پھول کی جانب ہاتھ بڑھاؤں
ہاتھ میں آئیں کانٹے
دینے والا شام سویرے
یوں تو خواب ہی بانٹے

قوسِ قزح کی پینگ ہلاروں
ٹوٹ ٹوٹ رہ جائے
یہ کیا بھید ہے مانگنے والا
سکھ مانگے ، دکھ پائے

میں منزل کے پیچھے بھاگوں
منزل آگے آگے
خواب کے کس دھاگے کو پکڑوں
کچے سارے دھاگے

پھر بھی میرے آگے پیچھے
خوابوں کی سب مایا
پل پل میرا رستہ روکے
روپ سروپ کی چھایا

من کی شکتی پاؤں تو
یہ سب چھایا چھٹ جائے
موہ کی دھند، یہ تن پرچھائیں
رستے سے ہٹ جائے

سارے خواب ہیں بکھرے بکھرے
یہ کب ہوں گے پورے
من کی شکتی ڈھونڈنے نکلوں
تن کے خواب ادھورے

شب بھر کے مہمان

میرے جسم سے اٹھنے والی
تُو سوندھی خوشبو
میں ہوں تیری روحِ مجسّم
میرا پیکر تُو
میری آنکھوں میں لہرائے
چاند سی اک مُورت
شب بھر میرے پاس رہے تُو
شبنم کی صُورت
صبح کا سورج
کرنوں کی زنجیریں لے کر آئے
تیری یاد کا ہاتھ
مرے ہاتھوں سے پھسلتا جائے
خوشبو، شبنم، چاند کی جیوتی
شب بھر کے مہمان
دن کے سفر میں ڈھونڈنے نکلوں
میں اپنی پہچان

رات، سیپ، سمندر

مرا دل ہے سیپ سمندر
میں قطرہ قطرہ برسوں
ترے پیار کو پھر بھی ترسوں
جو تیرے لبوں سے پھوٹے
وہ چشمہ میرے اندر
مرا دل ہے سیپ سمندر

تُو رات کی ڈھلتی چھایا
تُو شبنم شبنم روئے
تُو اپنا سب کچھ کھوئے
تُو جس کے پیچھے بھاگے
وہ سورج تو اک سایہ
تُو رات کی ڈھلتی چھایہ

کب رات ڈھلے دن آئے
کب سیپ سے موتی نکلے
سورج سے جیوتی نکلے
کب میل ہو تیرا میرا
کب دل دل سے مل جائے
کب رات ڈھلے دن آئے

وہ لمحہ اب بھی زندہ ہے

وہ لمحہ اب بھی زندہ ہے
تجھے جب میں نے دیکھا تھا
مجھے جب تُو نے دیکھا تھا
اگرچہ اجنبی تھے پھر بھی ہم مانوس تھے کتنے!
فروزاں تیری میری روح میں فانوس تھے کتنے!
اچانک وقت کی دیوار حائل ہو گئی ایسے
کہ ہم اک دوسرے کے دکھ سے واقف ہی نہ تھے جیسے
بگولے کی طرح میں دشت و صحرا میں بھٹکتا تھا
تُو اوجھل میری نظروں سے، صدف جیسے سمندر میں

مگر اپنی محبت غوطہ زن ایسی سمندر سے صدف جس نے نکالا ہے
بگولا اپنی چاہت کا، مکمل چاند کا، خوش بخت ہالہ ہے

وہ لمحہ اب بھی زندہ ہے
مرے تن میں، مرے من میں
ترے رس میں، ترے مس میں

تری آنکھوں کی چلمن سے
تجھے جب میں نے دیکھا تھا
مری آنکھوں کے روزن سے
مجھے جب تُو نے دیکھا تھا
وہ لمحہ اب بھی زندہ ہے

شہکار و فنکار

بے ثمر موسموں میں

وہ مجھ سے مِل تو یہ کہنے لگی

'جب ترے پیار کی بارشوں میں نہاتی تھی مَیں

کتنی زرخیز و شاداب تھی، کتنی آباد تھی

مگر وقت نے جب سے ہم کو جدا کر دیا ہے

میں اندر سے زرخیز ہوتے ہوئے بانجھ سی ہو گئی ہوں'

میں بولا

'ترے بعد میں بھی وہ سوکھا تنا رہ گیا ہوں

کہ اندر سے جس کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہوں

بڑی دیر کے بعد اب مجھ پہ روشن ہُوا ہے

کہ میری جڑیں تو ترے جسم کی سرزمینوں میں پھیلی ہوئی ہیں

کہ مَیں تیری تاریخ ہوں اور تُو میرا جغرافیہ ہے

کہ میں تیری تخلیق ہوں میری فنکار ہے تُو

اگر کوئی تاریخ بھی اپنے جغرافیے سے جدا ہو

اگر کوئی تخلیق بھی اپنے فنکار سے روٹھ جائے

تو دونوں کا مقسوم ان بے ثمر موسموں کی یہ بوجھل فضا ہے

جہاں اپنا ہونا نہ ہونا برابر ہے
جو سب سزاؤں سے بڑھ کر سزا ہے

چلو میری جاں
آج ہم اور تُو ایک ہو جائیں
ان بے ثمر موسموں کو ثمر بار تحفہ ملے
میں بچھڑی ہوئی اپنی تاریخ کو
تیرے سینے کے جغرافیے میں بسا لوں
تُو اپنے ضیا بار شہکار کو
آنے والی بہاروں کے رنگوں ۔امنگوں سے سیراب و شاداب کر دے
کہ تازہ جہاں ایک تخلیق ہو
جو ہماری محبت کی تصدیق ہو ۔

لمحے کا سفر

مَیں اُڑتا ہُوا ایک لمحہ
ابھی ہوں ابھی مَیں نہیں ہوں
مَیں خوشبو کا جھونکا
ابھی مَیں یہاں ہوں، ابھی مَیں وہاں ہوں
مگر یہ تمھیں کیا خبر مَیں کہاں ہوں
مَیں اُڑتا ہُوا ایک جگنو
مَیں ہاتھوں سے نکلوں تو ماضی کا ورثہ
اگر ہاتھ آؤں تو مَیں حرف کا ایک روشن ستارا
مَیں بہتا ہُوا ایک جھرنا
مَیں لمبی مسافت کے پھیلے اُفق پر
سمندر سے ملنے کی خواہش میں بیتاب و رقصاں
مَیں سب کی رفاقت میں خنداں
بچھڑ جاؤں سب سے تو گریاں

ادھر ہے سفر میرا پیچھے اُدھر ہے سفر میرا آگے
مری دھڑکنوں میں ہر اک دَور جاگے
مَیں سب میں رہوں اور اُڑتا پھروں چارسُو
کوئی مانے نہ مانے
مری دسترس میں ہیں سارے زمانے

مرے آثار بھی دیکھو

میں آثارِ قدیمہ دیکھنے آیا تھا پہلے بھی
مگر اس بار تو لگتا ہے، جیسے
مَیں بھی اس بکھری ہوئی تہذیبِ انسانی کا حصّہ ہوں
کوئی صدیوں کا قِصّہ ہوں
مرے چہرے پہ کیسے جھرّیوں نے آشیانے سے بنائے ہیں
مرے ہاتھوں سے لے کر میرے سارے جسم پر
یہ پھیلتی بڑھتی لکیریں
جانے کن رستوں کو جاتی ہیں ــــــ!
یہ میرے چار سُو منہ بولتے آثار ہیں کتنے!
مرے اندر بھی میری روح کے اسرار ہیں کتنے!
ــــــ نہیں مَیں داستاں کا کوئی شہزادہ
میں اس مٹّی کا اک کردار ہوں
اپنی جہاں بانی پہ کتنا سرکشیدہ ہوں
مگر اپنے ہی ہاتھوں سر بریدہ ہوں

مرے آثار میں ڈھونڈو مجھے
آؤ مری انگلی پکڑ کر آؤ
یہ آثار بھی دیکھو
مرے اِس پار بھی دیکھو
مرے اُس پار بھی دیکھو

تیرے میرے راستے

تیرے راستوں سے ملے ہوئے
مرے راستے بھی عجیب ہیں
کبھی تُو جو دل میں سما گیا
تو سمٹ سمٹ گیا وقت بھی
تو سبھی لکیریں یہ ہاتھ کی
تری روشنی سے چمک اٹھیں
مرے پاس آ گئیں منزلیں
کبھی تُو نے نظریں جو پھیر لیں
تو نہ دل رہا نہ نظر رہی
مجھے کچھ نہ اپنی خبر رہی
کہیں کھو گئے، کہیں سو گئے
مرے سامنے تھے جو راستے
بڑی دیر سے اسی سوچ میں
ہے یہ میرا دل بھی دماغ بھی
کہ یہ اپنا سنگِ وجود ہی
مری ذات میں تری ذات میں

کوئی غیر بن کے کھڑا نہ ہو
یہی تجھ سے مجھ سے بڑا نہ ہو
میں ترا جمالِ سحر بنوں
ترے پھول میں مَیں کھلوں
کبھی مثلِ بادِ صبا چلوں
کبھی رنگ رنگ میں مَیں ڈھلوں
تو عجب ہے کیا تجھے پا سکوں
تری روشنی میں سما سکوں

انکشاف

گلی میں شور ہے اتنا
کہ آوازیں
دھماکوں کی طرح دل سے گزرتی ہیں

کہاں وہ دن
کہ جب بچپن کی گلیوں سے گزرتے تھے
تو اپنے دل کی دھڑکن سے
صدائے ساز آتی تھی
ترِی آواز آتی تھی
اسی آواز کی انگلی پکڑ کر
وقت کی اس آخری سرحد پہ پہنچے
تو کھُلا
دل میں دھماکوں کے سوا کچھ بھی نہیں باقی
دھماکے جن کی زد میں ساری دنیا ہے

نہ وہ میں ہوں نہ وہ تو ہے
نہ تتلی ہے نہ خوشبو ہے
بس اک جبرِ مسلسل ہے
جو ہم دونوں کا قاتل ہے
جو لاحاصل کا حاصل ہے

بعد از وقت

تو نے بھی مجھ سے کج ادائی کی
میں نے بھی تجھ سے بے وفائی کی
پھر بھی مجھ کو یہی شکایت ہے
با وفا میں تھا بے وفا تو تھا
پھر بھی تیری یہی حکایت ہے
تُو ہی سچا تھا میں ہی جھوٹا تھا
آج تک فیصلہ نہ ہو پایا
آزمائش گہِ محبت میں
کون سچّا تھا کون جھوٹا تھا
اور اِسی کشمکش کے عالم میں
کتنی عمریں ہماری بیت گئیں
— اب کہ سورج میں روشنی کم ہے
برف سی گِر چکی ہے بالوں پر
تو کہیں راز یہ ہُوا افشا

ہم تو دونوں تھے چاہنے والے
ہم تو دونوں ہی دل کے سچے تھے
یہ نظامِ قدیم ــــــ یہ بوڑھا
ہم پہ صدیوں سے جو مسلّط ہے
جس کو دعویٰ ہے نوجوانی کا
یہ ہی ظالم رقیب تھا اپنا
ورنہ یاں بھی تھا تیرا متوالا
اور تُو بھی حبیب تھا اپنا

دروازہ

بے روزن ذات کے زنداں میں
موجود کا اک دروازہ ہے
جو چاروں جانب کھلتا ہے
سورج دروازے پہ آ کر
کرنوں کے سنہرے ہاتھوں سے
ہولے سے دستک دیتا ہے
اس جگمگ کرتے سورج میں
ہونے کا نور شعور بھی ہے
وجدان بھی ہے عرفان بھی ہے
لَو دیتی ہوئی پہچان بھی ہے
چاہیں تو اس دروازے سے
آگے بڑھ کر سُن سکتے ہیں
ہم اپنی رُوح کا آوازہ
یہ سب رستوں کا سنگم ہے
یہ وقت کے چہرے کا غازہ
یہ دل دروازہ کھول کے ہم

بے روزن ذات کے زنداں سے
اک جست میں باہر آ کر سب
سورج سے گلے مِل سکتے ہیں
کر سکتے ہیں ہم اندازہ
اُس چاہت کا اُس عظمت کا
وہ جس کا تاج لیے سر پر
ہر صبح سویرے گھر گھر کے
دل دروازے پر آتا ہے
اور اپنے چاہنے والوں کے
سر پر یہ تاج سجاتا ہے
جب شام سواری آتی ہے
خود چپکے سے چھُپ جاتا ہے

لمحے کا قرض

میرے فسانے، تیرے فسانے
اک لمحے میں سارے زمانے
وقت کی بے پایاں گردش سے
اک لمحہ بھی کٹ جائے تو
سارے ہی دریا تھم جائیں
ساری ہی گھڑیاں رُک جائیں
سارے سمندر رستہ بھُولیں
سارے پہاڑ چٹخنے جائیں
روئی کے گالوں کی صُورت
دنیا بھر کو دھنک کر رکھ دیں

اک لمحے میں روزِ قیامت
اک لمحہ ہے اپنی امانت
اس کو سنواریں اس کو نکھاریں
وقت کے آئینے میں اُتر کر

آؤ اس لمحے کو ابھاریں
جو نہ ہُوا انسان سے اب تک
ہم وہ کام بھی کرتے جائیں
اس لمحے کا قرض اُتاریں
سارے قرض اُترتے جائیں

آگہی، زندگی

سمندر کے سینے پہ یہ رقص کرتے ہوئے
دائرے دیکھتے ہو
یہ سب تیز رو خود شناسا مسافر
فقط دائرے ہی نہیں
یہ گہرے سمندر کے دل کی
چھلکتی ہوئی دھڑکنیں ہیں
جو ایک ایک لمحے کی صورت ابھرتی ہوئی
دیکھتے دیکھتے
سب کی آنکھوں سے اوجھل ہوئی جا رہی ہیں
دوستو، ان کے پل بھر کے اس رقصِ پیہم پہ
یوں طنز سے مسکراؤ نہیں
ان کا رقصِ مسلسل
تو خود زندگی کے تسلسل کا غماز ہے
وقت کے لمحے لمحے کے ساتھ
اس کی پرواز ہے
یہ سمندر کے سینے میں گم

کتنے بھیدوں، خزینوں، دفینوں کا ہمراز ہے
ـــــ کبھی یہ بھی سوچو
کہ جو سانس تم لے چکے ہو

کہاں ہے
کہیں بھی نہیں ہے
مگر پھر بھی سانسوں کی شہنائی بجتی چلی جا رہی ہے
جو چاروں طرف مسکراتی ہوئی زندگی کی امیں ہے
یہ جھونکا جو شرمیلی کلیوں کو چھُو کر گیا ہے
وہ کلیاں تو اب پھول بن کر مہکنے لگی ہیں
مگر خود یہ جھونکا
نئی وادیوں مرغزاروں کی ان وسعتوں میں رواں ہے
جہاں جا کے کوئی بھی لوٹا نہیں ہے
ـــــ تو پھر یہ تعجب ہے کیسا
اگر دائرے زندگی کے سمندر پہ یوں
رقص کرتے ہوئے
ٹوٹتے پھوٹتے جا رہے ہیں!
ـــــ اگر مجھ سے پوچھو
تو یہ دھڑکنوں کی حرارت سے
تابندہ موتی

حسیں بلبلے
ننھے منے مسافر
سمندر پہ یلغار کرتی ہوئی
ہر ریاکار موجِ مخالف سے ٹکرا کے

یوں جاں سے جاتے ہیں جیسے
کسی منزلِ دل، کسی ساحلِ نو
کے پھیلے ہوئے روشنی کے افق پر
ابھرتے ہوئے مہرِ فردا کی تابندگی کے لیے
جسم و جاں کی شہادت ہی وہ آگہی ہے
جو ہستی کے نیلے سمندر پہ
ان رقص کرتے ہوئے دائروں
جگمگاتے ہوئے تیز رو گرم لمحوں
مہکتے ہوئے نرم جھونکوں کی
رفتار و گفتار میں سانس لیتی ہوئی بیکراں، جاوداں زندگی ہے

شہ پارہ

یہ ہستی ایک سمندر ہے
گہرے بے انت سمندر میں
لہریں اٹھتی ہیں چلتی ہیں
گرتی ہیں اور سنبھلتی ہیں
ان روتی ، ہنستی لہروں کے
بکھراؤ اور سبھاؤ میں
اک طوفاں پلتا رہتا ہے
جو وقت کے بے کل سانچے میں
چپکے سے ڈھلتا رہتا ہے
جب تیز ہوائیں چلتی ہیں
یہ طوفاں شور مچاتا ہے
تہ میں جو ہیرے موتی ہیں
سب کو اُوپر لے آتا ہے
ساحل پہ بسنے والوں کو
یہ اپنے پاس بلاتا ہے
تب مانجھی .اور شناور سب

اس طوفاں سے ٹکراتے ہیں
پتوار بنا کر موجوں کو
طوفاں کو راہ پہ لاتے ہیں
یہ طوفاں اُن کی ہمت سے
سکھ کا ساحل بن جاتا ہے
صدیوں کے روگ مٹاتا ہے
ہستی کے نرم سمندر میں
اک بستی ایسی بستی ہے
جو جنّت کو شرماتی ہے
جو چاہت کا گہوارہ ہے
جو حاصل ہے سب خوابوں کا
جو انساں کا شہ پارہ ہے

کھلونے، ایٹم اور پھول

مَیں کیا تم سے نہ کہتا تھا
نہ کھیلو ان کھلونوں سے
کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں
مگر تم مانتے کب تھے!
جو لمحہ آنے والا تھا
اُسے تم جانتے کب تھے!
تمہیں تو عمرِ رفتہ سے بھی بڑھ کر
پیار تھا اپنے کھلونوں سے
تم اُن سے کھیلتے تھے یوں کہ جیسے تم بھی بچے ہو
تمہیں بچوں میں ہنستا کھیلتا جب دیکھتا تھا میں
تو یوں لگتا تھا جیسے تم زمانے بھر کے داناؤں سے سچے ہو
— مگر اُس آنے والے ایک لمحے کو
تم اپنی ساری سچائی سے بھی
کب تک، کہاں تک روک سکتے تھے

اُس اک لمحے کے اک ذرّے میں ایٹم کا دھماکا تھا
دھماکا ہو گیا آخر
اُس ایٹم کے دہلانے پر
جو سب سے خوبصورت ایک بچہ، ایک نازک سا کھلونا تھا
اڑا وہ سب سے پہلے
اور اُس کے بعد آنے والی سب نسلیں
اسی آتش فشاں لمحے، اسی ایٹم کی زد میں ہیں
یہ سب زندہ ہیں لیکن یوں کہ جیسے سب لحد میں ہیں
— تم ان بچوں کے خالق ہو، تم ان بچوں کے مالک ہو
کھلونوں کو تو آخر ٹوٹ جانا تھا
مگر یہ کیا خبر تھی تم بھی ان کے ساتھ ہی ایسے بکھر کے
ٹوٹ جاؤ گے
— اٹھو اب خواب سے جاگو
اٹھو، ٹوٹے ہوئے ریزوں کو جوڑو
پھر سے آئینہ بناؤ
اپنے گھر کو پھر کھلونوں سے سجاؤ
سب نئے بچے، نئے چہرے، نئی نسلیں تمہارے ساتھ ہیں
تم کو بلاتی ہیں
یہ کہتی ہیں

'کہ آؤ سچ کا سچا کھیل کھیلیں
اور اب کی بار ایٹم کے دہانے پر
محبت کا وہ پیارا پھول رکھ دیں
جس کی خوشبو جاودانی ہے
جو ہم سب کی زبانِ بے زبانی ہے '

خدا — یا خدا —!

یہ جادو ہے کس سامری کا
کہ کچھ آدمی دیکھتے دیکھتے
شیر اور بھیڑیئے بن گئے ہیں
وہ حیواں ہیں لیکن
سروں پر رعونت کے وہ تاج پہنے ہوئے ہیں
کہ جنگل کے سب بے زباں نرم دل جانور
ان کی ہیبت سے یوں کانپتے ہیں
کہ خود ان کے قدموں میں آ آ کے گرتے ہوئے
لقمۂ تر بنے جا رہے ہیں
— عجب خوف و دہشت کی تاریکیوں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی یہ فضا ہے
کہ آج ان کی خاموش فریاد بھی
اُن کے دِل کی دعا کی طرح
سارے جنگل میں اک گونج بن کر اُبھرتی چلی آ رہی ہے
— نہ جانے ستم کی سیہ رات کب ختم ہو گی
خدا — یا خدا —!
بے زبانوں کو بھی آج اُس اسمِ اعظم کا حرف آشنا کر

جو ہم سب کے سینوں سے باہر نکل کر
اُسی سامری کی کھلی ساحری کو
بس اک پھونک سے راکھ کر دے
جو کرّوے سمندر کے اُس پار بیٹھا ہُوا
انگلیوں کے اشاروں پہ ہم کو نچاتا ہے
لیکن ہمارے ہی خوں پر وہ خود پل رہا ہے
جو کچھ شیر اور بھیڑیئے ہر طرف چھوڑ کر
ہم کو جنگل میں رہنے کی اور اپنے ہونے کی
نارِ مسلسل میں یوں جھونکتا جا رہا ہے
کہ تیرے جہنم بھی اُس کے مقابل میں سب ہیچ ہیں
— یا خدا بھیج پھر کوئی موسیٰ
ہمیں وہ عصا اور وہ دستِ بیضا عطا کر
کہ جو زر کے پانی سے دھوئے ہوئے زرد چہروں پہ چپکی ہوئی سرد آنکھوں میں
سونے کا، چاندی کا پگھلا ہُوا گرم زہراب بھر دے
جو اس عہد کے سامری کو
اُسی کی ہوس کے اُبلتے چھلکتے سمندر میں غرقاب کر دے

— خدا — یا خدا — !
ہم کو کھوئی ہوئی اپنی شکلوں میں واپس بلا
ہم کو توفیق دے

پھر سے ہم سبز جنگل، ہری وادیوں اور کھلے گلستانوں سے ہوتے ہوئے
اُس بڑے راستے پر چلیں
کتنی صدیوں سے جو نسلِ آدم کی پہچان کا راستہ ہے
جو اپنی زمینوں کی زرخیز قوسوں
خلا کے دھنک زاویوں سے گزرتا ہُوا
نیلے گنبد کے روشن، چمکتے دمکتے ہوئے کہکشاں راستے
کی طرف جا رہا ہے

حرفِ لوحِ زماں

(مجید امجد کی یادیں)

بجا کہ طاق پہ رکھا ہُوا چراغ ہے تُو
جو لازوال و معطّر ہے وہ دماغ ہے تُو

سراغ پا نہ سکا بے سراغ صدیوں کا
سو اب جہاں کے لیے خود بھی بے سراغ ہے تُو

کسی سے مِٹ بھی سکا ہے کبھی یہ چاند کا داغ
تُو داغ تو ہے مگر روشنی کا داغ ہے تُو

تجھی کو چاٹ گئیں طائروں کی منقاریں
چمن کھلا کے بھی کتنا اُداس باغ ہے تُو

عجب نشہ ہے ترے فکر کی اڑانوں کا
جو سب کے دل میں اتر جائے وہ دماغ ہے تُو

سحر سے رشتۂ جاں استوار ہے تیرا
بہت طویل ہے شب اور شبِ چراغ ہے تُو

اِسی کی آگ میں تو خود بھی جل بُجھا آخر
کمالِ فن سے پگھلتا ہُوا ایاغ ہے تُو

مکان چھوڑ دیا ہے وجود کا تُو نے
مگر جو لوحِ زماں پر ہے وہ سراغ ہے تُو

یہ درد و کرب اِسی بیسویں صدی کا ہے
کہ زخم زخم ہوں میں اور داغ داغ ہے تُو

کالی رات، چمکتا سُورج

خواب تمہارے ماضی کی میراث ہوئے
کیوں خوابوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہو!
ماضی تو ماضی ہوتا ہے
وہ کب لوٹ کے آتا ہے!

حال سے تم کیسے آنکھیں دو چار کرو!
حال کی راہوں پر چلنا تو انگاروں پر چلنا ہے
اور خود اپنے ہاتھوں سے
انگارے کون چباتا ہے!
ہم کو یہ معلوم ہے تم کیوں مستقبل کے نام سے بھی گھبراتے ہو
مستقبل تو انجانے رستوں کا جال ہے
ان رستوں پر کون چلے!
رات سے تم ڈرتے ہو
تم تو گھر کو واپس آجاتے ہو شام ڈھلے!

تم کو یہ معلوم بھی ہے!
جو ماضی کے خوابوں کو وابستۂ حال نہیں کرتے
ان کے گھر میں کالی رات ہی رہتی ہے
اور جو کالی رات میں دل کی مشعل روشن رکھتے ہیں
ان کے سامنے مستقبل خود راہیں روشن کرتا ہے
سورج ان کے استقبال کو آتا ہے
انجانی راہوں پہ اپنے ساتھ انہیں لے جاتا ہے
کیا کیا بھید بتاتا ہے!

دنیا زینہ، دل آئینہ

دنیا بھی اک زینہ ہے
تم جتنا بھی اس لچکیلے، اس چمکیلے زینے پر چڑھتے جاؤ گے
یہ زینہ آباد مکانوں، سبز جہانوں سے بھی لمبا، اونچا ہو ہو جائے گا
تم چاہو گے سارے مکانوں، سارے جہانوں، سارے زمانوں پر
بس ایک تمہاری ذات کا پرچم لہرائے
ہر سُو ایک تمہارے نام کی زرد حکومت ہو
اور زمینوں پر بسنے والے سارے لوگوں کے جذبے سرد رہیں
جتنے مرد ہیں گرد رہیں
دل بھی اک آئینہ ہے
اس میں جھانک کے دیکھو تو
آئینے کے منظر پر تحریر ملے گا اجلا حرف صداقت کا
جب تم اجلے حرف کے جوہر سے منسوب کرو گے ذات اپنی
روح تمہاری دُھل جائے گی
سارے زمانے گُھل جائیں گے جسم میں بہتے خون کی رنگیں نہروں میں

ایک انوکھی سیرابی، شادابی کا چرچا ہوگا
دنیاؤں دنیاؤں، شہروں شہروں میں
بولو! اُوپر جاؤ گے تم زینے پر ــــ!
یا اُترو گے اپنے دل آئینے میں ــــــ!
زینہ ٹوٹ گیا تو خوف کا منظر عبرت کا نقشہ ہوگا
آئینہ ٹوٹا تو کرچی کرچی سے اک آئینہ پیدا ہوگا

زندگی کے میلے میں

زندگی ، زندگی تو ہے لیکن
کیا اسے سینت سینت کر رکھیں
اور اس احتیاط کے باوصف
ایک دن زندگی کے میلے سے
رات اور دن کے اس جھمیلے سے
اک دھندلکے کی رہنمائی میں
وقت کی بے سراغ راہوں پر
آپ ہی آپ کوچ کر جائیں
اس طرح اپنی موت مر جائیں
یاد بھی ہم کو ڈھونڈنے نکلے
تو بھی اپنا سراغ پا نہ سکے
زندگی ، زندگی تو ہے لیکن
ہم اسی زندگی کے میلے میں
کیوں نہ ڈھونڈیں وہ جاوداں لمحہ
حاصلِ کائنات جو ٹھہرے
مرکزِ ممکنات جو ٹھہرے

اور تسخیر کرتے کرتے اِسے
سر خوشی سے شہید ہو جائیں
آج تک بند ہیں جو دروازے
اُن سبھی کی کلید ہو جائیں
آنے والی تمام نسلوں کے
آخرِ کار کچھ تو کام آئیں

عشق ہے دیوانہ پن

کارواں سے بچھڑنے کا غم تو بہت ہے
مگر کیا کبھی کوئی لیلیٰ
کسی قیس کو سیدھے رستے پہ چلتے ہوئے بھی ملی ہے ——— !
لیلیٰ جاں تو آدرش ہے کوئی منزل نہیں ہے
اور آدرش تو کارواں سے بچھڑنے کے بعد اپنی جاں سے گزر کر ہی ملتا ہے
آدرش کا نام دیوانگی ہے
وہ دیوانگی
جس نے ہر قیس کو پہلے مجنوں بنایا
اُسے کارواں سے بچھڑنا سکھایا
پھر اُس کو ہر اک ذرۂ ریگ کی آتشِ بے محابا سے
تپ کر نکلنے کا رستہ بتایا
اُسے اپنی لیلیٰ کے قالب میں لاکر بسایا
ازل کو ابد سے ملایا
—— یہ دیوانگی میرا آدرش ہے، زندگی ہے
یہی عشق ہے
اور اسی عشق سے
حسن کی جلوہ گاہوں میں تابندگی ہے

کھرا کھوٹا

تُو راجہ ہے
میں پرجا ہوں
تیرے چہرے پر میرا چہرہ ہے
میرے آئینے میں بھولی دنیا
تیرا چہرہ دیکھ رہی ہے
دنیا کی الجھی سلجھی نظروں میں
تُو کیسا بھگوان بنا ہے ــــــ!
ساری خلقت اب تیری چاکر ہے
تو سب کا ٹھاکر ہے
ساری دنیا میں اب جے جے کار ہے تیری
اور میں آئینے کے اک گوشے میں بیٹھا مُسکاتا ہوں
سوچ رہا ہوں
جب راجہ کے چہرے سے
پرجا کا یہ چہرہ اُترے گا
پرجا تو پرجا ہی رہے گی
لیکن راجہ کا کیا ہوگا ــــــ!

زمیں کی سمت لوٹ آؤ

غبارہ جب ہَوا کے زور سے اڑتا ہے
کتنی دُور جاتا ہے
مگر آخر ہَوا بھی ساتھ اُس کا چھوڑ دیتی ہے
فضا سے اس کا رشتہ توڑ دیتی ہے

پتنگ اڑتی ہوئی کتنی بھلی لگتی ہے
جب تک ڈور اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے
لیکن ڈور کٹ جائے
تو پھر قاتل ہَوا اُس کو
ہزاروں ڈبکیاں دیتی ہوئی
پھیلے ہوئے گہرے سمندر میں ڈبوتی ہے

زمیں سے کتنی اونچی آج انساں کی اڑانیں ہیں
مگر اپنی زمیں سے جن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے
ہوا کے زور سے وہ تا ابد
نیلی سی خوابیدہ فضا میں رہ نہیں سکتے

ہَوا کا زور جب ٹوٹے
تو اُن کی ذات کا پہلا غبارہ
سر پھری، اندھی پتنگ اُن کے تشخّص کی
خلا میں ریزہ ریزہ یوں بکھرتی ہے
کہ جیسے اُن کا ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ہے

ہَوا میں بازوؤں کے پَر لگا کر اڑنے والوں سے کہو
اپنی زمیں کی سمت لوٹ آؤ
زمیں سب سے بڑی پہچان ہے اپنی
زمیں کو چھوڑ کر اک گنبدِ بے در سے ٹکرانا ہے لاحاصل
زمیں کی جس میں خوشبو ہی نہ ہو
ایسی ہَوا کی دوستی اچھی نہیں ہوتی
وہ کوئی چاند ہو یا کوئی سورج ہو
زمیں کی روشنی سے اور کوئی روشنی اچھی نہیں ہوتی

ہمارا عہد زندہ ہو

وہ اپنا عہد تھا

جس عہد میں ہم لوگ

سب زندہ تھے شرمندہ نہیں تھے

جاں ہتھیلی پہ لیے پھرتے تھے

شب بھر جاگتے تھے

اور افق کے بند دروازے پہ

جب پھول شفق دستک دیا کرتی تھی

ہم کہتے تھے ــــ لو سورج اُبھر آیا

اسی خورشیدِ جاں کے ساتھ رہنا تھا سفر اپنا

شعورِ زندگی بھی تھا

یہی ذوقِ نظر اپنا

مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے

اس ہم سفر کو

رات کی تاریکیوں نے گھیر کر جانے کہاں مارا

اکیلے رہ گئے ہم

لٹ گیا وہ قافلہ سارا

— مسافر اپنی اپنی ذات سے یوں کٹ چکے ہیں
جیسے وہ سب خواب تھا جو ہم نے دیکھا تھا
بس اب آٹھوں پہر
اک راکھ سی اڑتی ہے سینوں میں
مگر معلوم کیا اس راکھ میں بھی کوئی چنگاری سلگتی ہو
کبھی جب زور سے آندھی چلے
تو دفعتاً شعلہ زباں ہو کر بھڑک اٹھے
بشارت دفن ہے جس میں
زمیں وہ پھٹ پڑے
اور حال کی چھاتی دھڑک اٹھے
اُفق پر پھر وہی خورشید ابھرے
روشنی پھیلے
قفس کے در کھلیں
آزاد ہر قیدی پرندہ ہو
ہمارا عہد زندہ ہو

عہد آفریں

زندگی آئینہ خانہ ہے کوئی
جس میں چہروں کے چمن زار کھلے ہیں کیا کیا
آئینہ آئینہ تصویریں اُبھرتی ہی چلی آتی ہیں
ہر حسیں پھول کی خوشبو ہے جُدا، رنگ نیا
حیرتوں کا ہے وہ عالم کہ یہاں
اجنبی جب بھی کوئی آتا ہے
آئینہ خانے میں کھو جاتا ہے

اور کچھ دیر کے بعد
اپنا چہرہ بھی پرایا نظر آتا ہے اُسے
جہاں تصویر تھی اُس کی
کوئی سایہ نظر آتا ہے اُسے
جتنے بھی چہرے ہیں سب سائے سے بن جاتے ہیں
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے
ہر سائے کے پیچھے سے وہ تصویر ابھر آتی ہے

جس کا ہر سایہ تمنائی ہے
جس میں صدیوں کی توانائی ہے
آئینہ خانے کی تقدیر سنور جاتی ہے
سارا منظر ہی بدل جاتا ہے
وقت تصویر میں ڈھل جاتا ہے

ہم نصیب

رات کا مسافر ہوں
بے شمار تاروں نے
رات کی سیاہی میں
میرا ہاتھ تھاما تھا
لیکن اس مسافت میں
ایک ایک کرکے سب
مجھ سے ہو گئے رخصت
شاید ہر ستارے کی
اپنی اپنی منزل تھی
— اور اب مرے سر پہ
صبح کا ستارا ہے
جو مری امیدوں کا
آخری سہارا ہے
سوچتا ہوں یہ بھی کیا
ساتھ چھوڑ جائے گا
چھوڑ بھی گیا تو کیا

اِس کا اور میرا تو
ایک ہی نوشتہ ہے
ایک ہی تو قصّہ ہے
میں ہوں رات کا راہی
یہ ہے آرزو میری
صبح میری منزل ہے
یہ سحر کا حِصّہ ہے

امانت دار

تُم بھی اے دوست سچ ہی کہتے ہو
جبر و ظلمت کی قتل گاہوں سے
جن کو قبریں ملیں وراثت میں
اتنے اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں
اپنی ہی لاش اٹھائے پھرتے ہیں
اور اس کارِ بے ثمر کے سوا
اور کچھ بھی تو کر نہیں سکتے
لیکن ایسے بھی تو جیالے ہیں
جو شہیدوں کے آستانوں سے
سُولیاں ساتھ لے کے چلتے ہیں
موت کے درمیان پلتے ہیں
آہنی پیکروں میں ڈھلتے ہیں
جن کی بُو باس میں ، صداؤں میں
سارے رنگوں میں سب اداؤں میں
آج بھی وہ شہید زندہ ہیں
جو نئی صبح کے حوالے ہیں
جن کی تقدیر میں اجالے ہیں

امن کی خوشبو

امن — بچوں کی ہنسی
امن — بھائی کی، بہن کی چاہت
امن — محبوب کے ہاتھوں میں وفا کا بندھن
امن — دلہن کا سہاگ
امن — ماں باپ کا پیار
امن — انسان کے دل کا نغمہ
امن — رشتوں کی سنہری ڈوری
امن — خوشبو سے لدی بادِ بہار
فاختہ کب سے اسی امن کی شیدائی ہے
اُس سے کہتی ہے یہ زیتون کی شاخ
جنگ تو ختم نہ ہوگی شاید
یوں اکیلی ہی فضاؤں میں اُڑو گی کب تک؟
مجھ کو بھی امن کی خواہش ہے بہت
تم مرے پاس چلی آؤ کہ سکھ چین مِلے دونوں کو
صورتِ بادِ صبا مِل کے چلیں
امن کے پھول کھلیں
اور پھولوں کی مہک پھیلتی جائے ہر سُو

سوالیہ

ایک معصوم لڑکی کے ہاتھوں میں زیتون کی شاخ ہے
اور سر پر حسین فاختہ کی اڑانوں کی چھتری کا سایہ
کچھ اِس طور سے رقص میں ہے
کہ سورج الاؤ بھی اُس کو جلانے سے قاصر ہے۔ لیکن
عقابی جہازوں کی پرواز
اُس پر جھپٹنے کو تیار ہے

جب حسیں فاختہ مر گئی
اور معصوم لڑکی کے ہاتھوں سے زیتون کی شاخ بھی گر گئی
ان عقابی جہازوں کی یلغار کے ساتھ
سورج الاؤ بھی نیچے زمیں پر اُترنے لگا
فاختہ جیسی معصوم لڑکی کے سینے سے اُگتی ہوئی
نرم زیتون کی شاخ کو
اپنے سیلابِ خوں میں بہا لے گیا
جب نہ کشتی رہی اور نہ ساحل رہا
کون کس کو پکارے گا

میرے خدا !

بول !

کچھ تو بتا !

بول !

کچھ تو بتا !

ذات سے مکالمہ

لوگ چُھپ کر گھروں میں بیٹھے ہیں
شہر میں قحطِ گفتگو ہے بہت
آؤ خود سے مکالمہ کر لیں

ذات میں کائنات ہوتی ہے
دل کے روزن سے پھوٹتی ہے کرن
اور دل ہی میں رات ہوتی ہے
ذات کی یہ محاذ آرائی
تب بھی جاری تھی اب بھی جاری ہے
ہم کرن کا سنبھال کر نیزہ
پہلے اندر کی ذات پر لپکیں
پھر گھروں کے عذاب سے نکلیں
چُپ کی دیوار میں شگاف کریں
اک دریچہ بنائیں خوشبو کا

اس دریچے سے آفتاب اُبھرے
چُپ کی گہری گھنی اندھیری رات
حدّتِ مہر سے پگھل جائے
دل کی ویرانیوں میں تُو بولے
پھر وہی شہرِ آرزو بولے

لوگ

شریکِ درد، سراپا محبّت لوگ ہوتے ہیں
جو سچ پوچھو تو سب سے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں

لیے پھرتے ہیں اپنے ساتھ اپنی جاں کا نذرانہ
سخی کہتے نہیں خود کو سخاوت لوگ ہوتے ہیں

جنہیں کھوٹا سمجھ کر اہلِ مسند پھینک دیتے ہیں
وہی کتنے کھرے اور بیش قیمت لوگ ہوتے ہیں

اِنہی کے نام کی خوشبو ہے سارے گلستانوں میں
کہ ہر موسم کی خوشبوئے صداقت لوگ ہوتے ہیں

لکھے جاتے ہیں سارے فیصلے ان کی گواہی پر
کہ اپنے وقت کی سچی عدالت لوگ ہوتے ہیں

مسرت ڈھونڈنے والو بنوں میں، کہساروں میں
مسرت پاس رہتی ہے، مسرّت لوگ ہوتے ہیں

بہت نازآفریں ہیں، خواب آنے والے لمحوں کے
مگر زندہ و پائندہ حقیقت لوگ ہوتے ہیں

بہم تقسیم کرنے سے، مسلسل صرف ہونے سے
جو دولت اور بڑھتی ہے وہ دولت لوگ ہوتے ہیں

جمیلؔ اس دارِ فانی کی، جہانِ حُسن و معنی کی
ضرورت کون ہوتا ہے؟ ضرورت لوگ ہوتے ہیں

تاریخ بولتی ہے

جب زندگی کی سچی اقدار ٹوٹ جائیں
جب جھوٹ کے لبادے جسموں پہ جگمگائیں
جب غازۂ کدورت معیار بن گیا ہو
فنکار اپنے فن کی دیوار بن گیا ہو
ایماں سے دل ہوں خالی ایمان کی ہوں باتیں
انصاف روٹھ جائے احسان کی ہوں باتیں
جب چور بستیوں سے فتنے ابھر رہے ہوں
جب مکھیوں کی صورت انسان مر رہے ہوں
جب شاہ خود سجائیں کانٹوں کے تاج سر پر
زنجیر پاؤں میں ہو اور سامراج سر پر
جب پیار کرنے والا کوئی نظر نہ آئے
محکوم ہو اجالا اور حکمراں ہوں سائے
تب بے نوا رعایا اسرار کھولتی ہے
زنجیر ٹوٹتی ہے تاریخ بولتی ہے

بازگشت

(ایک نظم رفیق چوہدری کے نام)

سب کا ہے تو رفیق، مرا ہم سفر بھی ہے
جو تیری رہ گزر ہے مری رہ گزر بھی ہے
چل چل کے جس پہ آبلے پاؤں میں پڑ گئے
کتنے ہی ہم سفر تھے جو ہم سے بچھڑ گئے
تُو نے جو اپنے پیار کی دنیا بسائی ہے
یہ سارے دوستوں کے سفر کی کمائی ہے
پھولوں کے ساتھ تیری محبت جواں ہوئی
جب دوستوں کے ساتھ ملی بیکراں ہوئی
یوں رنگ و روشنی میں گھلی، حُسن میں ڈھلی
شب کا لباس اُتار کے بادِ صبا چلی
خوشبو صبا کے ساتھ اڑی، پھیلتی گئی
ذہنوں، دلوں، فضاؤں میں جو میل تھی، گئی

گو سب صداقتوں کے صلے میں صلیب ہے
تیرا ہے جو نصیب سبھی کا نصیب ہے
لیکن وہ کیا نصیب جو بدلا نہ جا سکے
وہ بازگشت کیا کہ جو واپس نہ آ سکے
خوں میں رواں جو تیری مری سرگزشت ہے
صدیوں کی آگہی کی یہی بازگشت ہے
تہذیب و فن اِسی سے محبت اِسی سے ہے
خوشبو اِسی سے حسن و صباحت اسی سے ہے
یہ بازگشت تا بہ ابد جگمگائے گی
تیرے مرے دلوں کی صدا ساتھ جائے گی

بساط

بساطِ دہر پر
صدیوں سے اب تک جنگ جاری ہے
اندھیرے اور اجالے کی
کوئی صورت نہیں لیکن سنبھالے کی

اکیلی فاختہ
نغموں کی شہنائی بجاتی ہے
مگر اس امن کی گڑیا پہ بھی
شہباز کے پنجے لپکتے ہیں
نہ اُس نے ہار مانی ہے
نہ یہ بھُولا ہے من مانے طریقے شاہبازی کے

اندھیرے اور اجالے کی
اسی آویزشِ باہم سے ہوتی ہے
شفق، خوں، روشنی
تینوں کی آرائش
نئی کلیوں، نئے گجروں کی افزائش
افق پر دُور مشرق سے

ابھرتے، لہلہاتے پھول سے سُورج کی زیبائش
یہ سورج امن کی گڑیا
اکیلی فاختہ ہو کے کان میں چپکے سے کہتا ہے
"نہ گھبراؤ
ستارے، رات کے روشن مسافر
صبح کی دُھن میں جو اپنی جان کھو بیٹھے
جو اپنا ننھّا مُنا دل بھی شبنم بن کے رو بیٹھے
وہ سب زندہ ہیں
سب میرے جلو میں ہیں
اِنہیں گمنام مت سمجھو
یہ پَو میں ہیں
یہ میری اپنی ضَو میں ہیں
کوئی دم میں
بساطِ دہر پر
یہ روشنی کے ہم سفر تارے نکلتے ہیں!
ابھی مہرے الٹتے ہیں!
ابھی منظر بدلتے ہیں!

آخری ملاقات

(احمد شمیم کی یاد میں)

شہرِ ممنوع میں
چُپ کے ویراں کدے کے نئے موڑ پر
سب کی نظروں سے چھُپ کر
مگر سب کے پیشِ نظر
وہ مجھے یوں مِلا
جیسے پہلے مِلا ہی نہیں
اُس کی آنکھوں کی ہلکی نمی
میرے دل کو شرابور کرتی گئی
اُس کے ہونٹوں کی بے چین سی مسکراہٹ میں پابندِ نَے
کتنے نغموں کے سُر دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتے گئے
اُس نے یوں ہاتھ میں ہاتھ لے کر دبایا
کہ مَیں اُس کی شدت
محبت کی حدت سے اندر ہی اندر پگھلتا گیا

مگر پھر وہ یوں اَن کہی کی زباں میں
خدا جانے کیا کیا فسانے سُناتا ہُوا مجھ سے رخصت ہُوا
روشنی کے لیے یوں اندھیروں میں گُم ہو گیا
آج تک زخم دل کا سِلا ہی نہیں
وہ مجھے یوں مِلا
جیسے پہلے مِلا ہی نہیں

سلسلہ

کبھی نظم کی ابتدا کرنے بیٹھیں
تو نوکِ قلم پر کوئی لفظ آتا نہیں
کبھی ذہن پر یوں خیالوں کی بارش سی ہوتی ہے
ہر لفظ اک پھول بن کر
پرندوں کی صورت چہکتا ہے
ساری فضا میں، ہَوا میں
مہک بن کے یوں پھیل جاتا ہے جیسے
خدا نے یہ دنیا بنائی
تو پہلے اسے سالہا سال سوچا
کوئی لفظ بھی اس کی نوکِ زباں تک نہ آیا
مگر پھر بس اک لفظ 'کن' سے
یہ سوئی ہوئی زندگی جاگ اُٹھی
پرندوں کی چہکار کے ساتھ یہ روشنی جاگ اُٹھی
خدا نے وہ شہ پارۂ فن تراشا

کہ جو لفظ و معنی کا
رنگ اور آہنگ کا جاوداں سلسلہ ہے
جس کے پیشِ نظر
جس کے زیرِ قدم
لمحۂ حال ہے اور لاانتہا کا سفر ہے
جو اک پیکرِ خاک ہے اور فوق البشر ہے

پوسٹر اور انسان

میں نے لفظوں کی مٹی سے انسان کا ایک پیکر تراشا
میں نے تشبیہ اور استعارے کے روغن سے اس کے سبھی نقش روشن کئے
رمز و ایما سے آنکھوں میں گہرائی، سانسوں میں شہنائی کے سُر جگائے
علامت کے سانچے میں انساں کو ڈھالا
تو وہ خالقِ کُل کا شہکار بن کر فروزاں ہُوا
معانی کا خوں اس کی رگ رگ میں جاری کیا
تو وہ مٹی، ہَوا، آگ، پانی میں تحلیل ہو ہو کے کتنی ہی شکلوں میں
ڈھلنے لگا

وہ جو شاعر کا اک خواب تھا
وقت کے یوں مقابل ہُوا
وقت کا رخ بدلنے لگا
اپنی تخلیق کو، اپنے انسان کو، اپنے شہکار کو
جب میں بازار میں لے کے نکلا
تو دیکھا
کہ بازار میں بھاگتے دوڑتے جتنے انسان ہیں
سب دکانوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں

سب کے چہروں پہ مہنگائی کے پورٹریٹ چپکے ہیں
ضرورت کی چیزیں کچھ اتنی گراں ہیں
کہ ہر شخص خود بک رہا ہے
اُس کا تن، اُس کا من، اُس کا دھن
اپنی ہی ذات کی سب دکانوں پہ نیلام میں اٹھ رہا ہے

میری تخلیق کو، میرے انسان کو، میرے شہکار کو
کوئی دیکھے، خریدے
سمندر کی مانند اچھلتی ہوئی دھڑکنوں کو گنے
اِس کے دل کو ٹٹولے
اِس کی پوجا کرے
اس کو خالق کا اوتار جانے
بھلا پوسٹروں میں لپٹے ہوئے
بھاگتے دوڑتے برق رفتار انسان کے کیسہ ذہن میں
اتنی فرصت کہاں ہے ـــــــــ!

یہ بازارِ شیشہ گراں تھا کبھی
اور اب اشتہاروں کا بازار ہے
یہاں اشتہاروں پہ اُگتی ہوئی

نت نئی ایک تصویر کی اپنی قیمت ہے لیکن
یہاں میری تخلیق کی، میرے انسان کی، میرے شہکار کی
کوئی قیمت نہیں ہے

آدمی اور مشین

کتنی مصروف زندگی ہے یہاں
اکثر اوقات اپنے آپ سے بھی
پیار کی بات ہی نہیں ہوتی
ان سے ملنے کی آرزو ہے بہت
پر ملاقات ہی نہیں ہوتی
روز و شب اس طرح گزرتے ہیں
جیسے اپنے لئے بھی غیر ہوں میں
زندگی کی مشین چلتی ہے
سنگ و آہن میں روز ڈھلتی ہے
آدمی سب اسی کے کل پرزے
دائروں میں اسیر لوگوں پر
اجنبیت کی حکمرانی ہے
کیسے اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے
سلسلے سارے آشنائی کے

خواب کچلے گئے مشینوں میں
وقت کی قید سے رہائی کے
— کتنی صدیوں کی یہ کمائی ہے!
وصل کا نام بھی جدائی ہے

کمپیوٹر اور انسان

یوں تو انسان دل بھی رکھتا ہے
اور اس کا دماغ ــــ دل کا چراغ
اور دونوں پہ ناز بھی ہے اُسے
لیکن اس کے شعور کا ہمزاد
یوں تو ہے قید کمپیوٹر میں
دل بھی پہلو میں گو نہیں رکھتا
پھر بھی کمپیوٹر اور انساں میں
ہم نے اُتنا ہی فاصلہ دیکھا
جتنا چاہت میں بے وفائی میں
کتنی صدیوں سے کارفرما ہے
کمپیوٹر کا دل نہیں پھر بھی
وعدۂ دوست یاد رکھتا ہے
بھول جیسی ہو ٹوک دیتا ہے
بے وفائی سے روک دیتا ہے
اور انساں، شعور کے باوصف

دل کی باتیں بھی بھول جاتا ہے
اور اس اپنی بے وفائی پر
اس طرح قہقہے لگاتا ہے
جیسے اپنی ہنسی اڑاتا ہے

مَیں اور مَیں

اپنی تکمیل کی خواہش تھی مجھے
میں نے تاروں پہ کمندیں ڈالیں
سیم گوں چاند کو تسخیر کیا
ایک ذرّے سے اگائے سورج
میں نے ہر پیکرِ تحقیق کے ساتھ
اپنے ہمزاد کو تخلیق کیا
میں نے جس اسم سے در باز کیے
اُس سے واقف مرا ہمزاد بھی تھا
دل تو میرا تھا محبت کا چراغ
ذہن اُس کا ستم ایجاد بھی تھا
اسم تو اُس نے چرایا تھا مرا
میری صورت بھی چرا لی اُس نے

اور اب صورتِ حالات ہے یہ
لفظ میرے ہیں زباں ہے اُس کی
تیر میرے ہیں کماں ہے اُس کی

میرا ہمزاد ہے ایجاد مری
اپنی ایجاد پہ روؤں کہ ہنسوں ـــــ!

بن گیا مَیں بھی اگر اُس کا ہدف
ختم ہو جائے نہ انساں کا شرف ـــــ!
وقت مڑ جائے نہ ماضی کی طرف ـــــ!

میں اک کوہ پیما

مَیں اک کوہ پیما
مرے سامنے آسمانوں کو چھوتی ہوئی برف کی چوٹیاں ہیں
میں ان چوٹیوں کو نگوں سار کرنے چلا ہوں
کہ انساں کے قدموں کے نیچے زمیں ہے
مگر اُس کا سر آسمانوں سے اونچا ہے
میں ان پہاڑوں کے پھیلے ہوئے سلسلوں میں وہ زینہ ہوں
جو آسمانوں کو جاتا ہے
اور آسمانوں سے ملتی ہوئی
اِن پہاڑوں کی ایک ایک چوٹی پہ پرچم کشائی کا منصب
مجھی کو ملا ہے
مگر تُو
مرا گھر ہے، میری محبت ہے، میری زمیں ہے
تُو ان لمحہ لمحہ پگھلتی ہوئی برف کی چوٹیوں سے بھی بڑھ کر حسیں ہے
یہاں ہر قدم موت میرے تعاقب میں رہتی ہے لیکن
نشیبوں سے آتی ہوئی
پھیلتی، جگمگاتی ہوئی

تیری آواز میں اس قدر زندگی ہے
کہ میں تیری آواز کے راستوں سے گزرتا ہُوا
تیری عظمت کے رسّوں کو تھامے ہوئے
اور تیری محبّت میں سرشار
ان مرمریں چوٹیوں کی طرح
موت کو بھی نگوں سار کرتا چلا جا رہا ہوں

— بس اب ایک ہی جست کا فاصلہ ہے
— میں اب سب سے اونچی
ہمالہ کی چوٹی پہ تنہا مگر سرکشیدہ کھڑا ہوں
میں انسان کی سربلندی کا پرچم
کُھلے آسمانوں پہ لہرا رہا ہوں

— مجھے پھر صدا دے مری جاں
میں پھر تیری آغوش میں آ رہا ہوں

دیوتا، انسان اور کشتی

دیوتاؤں نے ساری دُنیا پر
سالہا سال تک حکومت کی
اور جب گردشِ دراز کے بعد
دُھل کے نکلی زمین پانی سے
اور کھولیں شعور نے آنکھیں
دیوتاؤں نے چھوڑ کر دھرتی
آسماں کو بنا لیا مسکن
ملکوں ملکوں میں بادشاہوں کو
اپنا نائب بنا کے بھیج دیا
بادشاہوں نے دیوتا بن کر
دھرتی پُوجا کے نام پر کتنی
دیویاں داسیاں بنا ڈالیں
منڈیاں کُھل گئیں غلاموں کی
زرپرستوں نے جھولیاں بھر لیں
مال اسباب اور ضمیر بکے
کتنے شاعر، ادیب، پیر بکے

کتنے راجے، کئی مہاراجے
ایسے دھرنا جما کے بیٹھ گئے
جیسے دھرتی نہ ہو کسانوں کی
جیسے دھرتی انہی کا حصّہ ہو
اور ہل جل کے زندگی کرنا
کوئی گزرے دنوں کا قصّہ ہو
اور دن رات کارخانوں میں
کتنے مزدور، عورتیں، بچّے
ایسے دیتے رہے لہو کا خراج
جیسے سب تخت و تاج کے محتاج

آتی جاتی مہیب صدیوں میں
کتنے بھرپور انقلاب آئے
اور ہر بار انقلاب کے بعد
دیوتاؤں نے کتنے رُوپ بھرے
کارخانے، مزار، جاگیریں
بحر و بر، مرغزار، دشت و دمن
دیوتاؤں کی سب کمیں گاہیں
ان کے قبضے میں آسماں ہی نہیں

ساری سر سبز سرزمینوں پر
بے شمار ایٹم اور میزائل
ان کے دربان، ان کے چوکیدار
منتظر ہیں بس اک اشارے کے

سارے آثار ہیں تباہی کے
آخری دن ہیں بادشاہی کے
دیوتاؤں میں اور غلاموں میں
آخری معرکہ بپا ہو گا
آگ برسے گی آسمانوں سے
پھر سمندر اُبل پڑیں گے سبھی
تند رو پانیوں سے ابھرے گی
پھر کسی نوحِ وقت کی کشتی

دیوتاؤ، تمام انسانو
اپنے اپنے ضمیر سے پوچھو
اور پھر موج موج پر لکھ دو
بحر میں کون کون ڈوبے گا!
لہر کس کس کو پار اُتارے گی!

خودنگر

میں اجنبی مسافر
میں دل سے پوچھتا ہوں
کس سمت جا رہا ہوں
ہر راستہ کٹھن ہے
اتنا طویل جیسے
ویران راستے کی
منزل کہیں نہیں ہے
چپ چاپ چلتے چلتے
طوفاں میں گھر گیا ہوں
تاریکیوں میں اب تو
سورج بھی چھُپ گیا ہے
طوفاں کا شور مجھ کو
پہلے بہت ڈرائے
بجلی چمک چمک کر
پھر راستہ دکھائے
طوفاں کے تازیانے

میرے ازل سے دشمن
بجلی کی جھل جھلا جھل
میری رفیق و رہبر
دونوں سے میں بنا ہوں
لیکن وہی کروں میں
جو دل کہے۔ جو چاہوں
میں اپنا رہنما ہوں

نوُر پیکر

کھلاڑی !
تُو نے ساری عمر اپنے جسم کو توڑا
کھلے میدانِ ہستی میں
تُو گھوڑے کی تنومندی، ہرن کی تیز رفتاری کو اپنے ساتھ لے کر
کس انوکھی آن سے دوڑا
حریفوں سے بہت آگے نکل جانے کی کوشش کی
مگر منزل کے پاس آکر
تجھے ٹھوکر لگی تیری پھڑکتی سانس کی مشعل گری
پچھلے کھلاڑی نے
پھڑکتی سانس کی مشعل اٹھا کر اپنی اکھڑی سانس سے جوڑی
زمانے کی نگاہوں میں
وہ جیتا اور تُو ہارا
مگر تاریخ کہتی ہے
اُسے شہرت تجھے عظمت ملی
وہ آج کا زندہ کھلاڑی ہے

مگر تیرے جلو میں جگمگاتی مشعلوں کا ایک لشکر ہے
تو اس بہتے سمندر میں
ابد کا نور پیکر ہے

وہ آنے والا

یہ دنیا ایک اسٹیشن ہے
جس پر کوئی آتا، کوئی جاتا ہے
یہاں مَیں کتنی صدیوں سے کھڑا ہوں ـــ کون بتلائے!
میں کِس کا منتظر ہوں، کِس کو آنا ہے!
نہ اُس کا نین نقشہ میں نے دیکھا ہے
نہ اُس کو میں نے پرکھا ہے
اُسے بس اپنے سچے ذہن و دل سے مَیں نے سوچا ہے
اگر وہ آگیا تو سارا اسٹیشن مہک اٹھے گا
رنگوں، خوشبوؤں کا ایک میلہ سا نظر آئے گا
جو پہلے نہ دیکھا ہوگا دنیا نے
ـــ وہ آئے کاش آ جائے
کہ میں اُس کے تصور میں
ہر اک گاڑی کو تکتا ہوں
نہ اسٹیشن سے جاتا ہوں نہ تھکتا ہوں
ـــ وہ آنے والا یکتائے زمانہ کیوں نہیں ہوگا!
کہ میں بھی آج کا فنکار ہوں
میں بھی تو یکتا ہوں!

پہلا اور دوسرا محاذ

وہ میرے ہاتھوں کو چُوم کر ہوگیا ہے رخصت
کسے خبر ہے وہ مڑ کے واپس بھی آ سکے گا
کہ جنگ کے خوفناک لاوے میں جل بجھے گا

اُدھر ہے سرحد پہ پھر قیامت
اِدھر مرے دل میں مامتا کی وہی محبّت
کہ میرا بیٹا مری نگاہوں سے ایک پَل بھی نہ دور جائے
اگر وہ جائے تو سرخرو ہو کے واپس آئے

مگر یہ کیا قہر ہے
کہ ہر بار میرا بیٹا شہید بھی ہو مگر شہادت
مرے وطن کے نہ کام آئے
جو جنگ ہم سرحدوں پہ جیتیں
وطن میں وہ جنگ ہار جائیں
ہمارے دیہات میں چڑیلیں ہمیں ڈرائیں
ہمارے شہروں میں گدھ ہمیں نوچ نوچ کھائیں
اگر چڑیلوں کی اور گدھوں کی دراز دستی سے بچ بھی جائیں
تو یہ دساور سے آنے والے سفید ہاتھی ہمیں کچل دیں

وہ میرے ہاتھوں کو چوم کر ہو گیا ہے رخصت
وہ آج پھر اُس محاذ پر ہے
جہاں اُسے پھر قدیم دشمن کا سامنا ہے
مَیں سوچتی ہوں
کہ کیوں نہ مَیں ایک اور بیٹے کو
آج ایسے محاذ پر بھی کروں روانہ
جہاں مرے جیسی کتنی ماؤں کا ہے ٹھکانہ
محاذ دونوں ہی جاں گسل ہیں
انہی محاذوں پہ میرے دل ہیں
یہ دل دھڑکتے رہیں گے جب تک
تمام بیٹوں، تمام ماؤں کی آبرو بھی رہے گی زندہ
یہ آرزو بھی رہے گی زندہ، یہ جستجو بھی رہے گی زندہ
کہ زخم خوردہ عظیم دھرتی کے سارے بیٹے
تمام ماؤں کے رُوبرو ہوں
تو کیوں نہ پھر ہر محاذ پر ہم بھی سرخرو ہوں

صحرا کا بنجارہ

جہاں دشمنوں نے
ہر اک سر کی قیمت لگائی ہوئی ہے
وہاں ہر جیالا سپاہی
وطن کے لیے سر ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
اس طرح رزمِ ہستی میں اترا ہُوا ہے
کہ جیسے وہی قیس
صدیوں سے صحرا کی بے انت، بے خواب راتوں میں
اڑتا ہوا زخم خوردہ بگولا
ناقۂ لیلیٰ عصر کے گرد دُھومیں مچاتا ہوا کہہ رہا ہو
حُرمتِ عشق و فن
سجدہ گاہِ نگارِ وطن کے لیے
جان و تن کی تو کوئی بھی قیمت نہیں ہے
مری جان حاضر ہے
لے لو
مری جان حاضر ہے
لے لو،

منصور حلاج

مجھے قتل کر دو
مری روح کو نرم روئی کے گالوں کی صورت دُھنک دو
مری موت ہی میری وہ زندگی ہے
کہ جو آنے والے زمانوں کی تابندگی ہے

مرے ہاتھ پاؤں اگر کٹ گئے
مرا سر بھی قلم ہو گیا
جسم کی خاک بھی پانیوں میں اگر بہہ گئی
تو بھی لہریں مری یاد میں
ساحلوں پر سر اپنا پٹکتی رہیں گی
مرے پاؤں پھر بھی شہادت گہِ عشق کے راستوں پر
سوئے منزلِ آگہی یونہی بڑھتے رہیں گے
مرے ہاتھ سچ کی گواہی میں اُٹھتے رہیں گے
مرا سر قلم ہو کے بھی ظلم کے سامنے سرکشیدہ رہے گا
'انا الحق' کی للکار میں
میری جاں، ہر زماں جابروں کے مقابل بھی وہ کلمۂ حق کہے گی

کہ جو میری پہچان ہے اور میرے خدا کی زباں ہے
کہ جو خود شناسی، خدا آشنائی کا وہ معجزہ ہے
جو ہر دور میں دردمندوں کے دل کی دوا ہے

جو میری صدا ہے
جو انسانیت کی بقا ہے

آخری شہادت

میں بوڑھا محافظ ہوں ان بستیوں کا
جنہیں سالہا سال گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا گیا ہے
جہاں کے تقدس کو جبر و ہلاکت کے
بدشکل، بے آبرو، تند خو
بھاری بُوٹوں سے کچلا گیا ہے
میں بوڑھا محافظ ہوں اُن آنگنوں کا
جہاں میرے معصوم بچوں کو
نیزوں کے خونخوار دھاگوں میں برسوں پرویا گیا ہے
جہاں میرے کڑیل جوانوں کو
توپوں کے منہ زور پھیلے دہانوں کے
اندھے کنوؤں میں دھکیلا گیا ہے
جہاں چاند سی لڑکیوں، پھول سی عصمتوں کو سرِ عام لوٹا گیا ہے
میں بوڑھا محافظ ہوں ان گلشنوں کا
جہاں کوئی موسم بھی ہو
امن کے پھول کھلتے نہیں ہیں
مہک مر گئی ہے
جہاں ہر طرف تیز بارود کی بُو رچی ہے

وہ برسات کے گیت، چاہت کی وہ بارشیں
راستہ بھول کر جانے اب کس طرف جا چکی ہیں
کہ اب آسمانوں پہ بادل نہیں
راکٹوں کا، بموں کا دھواں ہے
مَیں بوڑھا محافظ ہوں
بے اسم، بے نام قبروں کا تنہا مجاور ہوں
صدیوں سے پیاسا ہوں
تاریخ کے ہر نئے موڑ پر پابرہنہ کھڑا ہوں
یہ میری زباں سوکھ کر تیز کانٹا بنی میرے تالو میں اٹکی ہوئی ہے
مگر پھر بھی میں پوچھتا ہوں
خدائے زمین و زماں، مالکِ بحر و بر
میں صدیوں سے اپنی گنہ گار آنکھوں سے جو دیکھتا آرہا ہوں
وہ کس کو بتاؤں، وہ کس کو سناؤں
یہاں تو ہر اک روز ہی روزِ محشر ہے لیکن
تُو اپنا بھی وہ روزِ محشر بپا کر
مری سُن،
مجھے اس عذابِ مسلسل سے آکر رہا کر
کہ میری یہ تنہا شہادت بھی آخر فنا ہو نہ جائے
کہ ابلیس ہی اِس جہاں کا خدا ہو نہ جائے

شہید کا کفن

ابھی تو اُس کا
کفن بھی میلا نہیں ہُوا ہے
تم آ گئے ہو
ابھی سے اُس کے
جواں لہو کا خراج لینے !
عوام سے تخت و تاج لینے !
تمھیں گماں ہے
کہ جس کا ڈر تھا، وہ مر گیا ہے، تو سب سکوں ہے
مگر کبھی تم نے آئینہ دیکھ کر یہ سوچا
تمھارے ہاتھوں، تمھارے چہرے پہ کس کا خوں ہے !
یہ موت سی سنگدل خموشی
کہ جس کے نیچے حیات پیہم سسک رہی ہے
یہ رات کی تہ بہ تہ گرانی
کہ جس کی زد میں
کرن کرن یوں بھٹک رہی ہے
کہ جیسے اپنے شہید سورج کی جستجو میں

کہیں بہت دور آگئی ہو
کرن کرن کی پکار بے کار تو نہیں ہے!

میں جانتا ہوں بڑے بہادر، بڑے جری ہو
مجھے خبر ہے
وہ خوف کا بھوت جو تمہارے دماغ میں ہے
وہ چور جو کب سے منتظر ہے تمہارے دل میں
کسی دھماکے، کسی بلاخیز زلزلے کا!
مگر دھماکا ہُوا تو اپنے ضمیر ہی سے پناہ مانگو گے
وہ تمہیں کو جھنجھوڑ ڈالے گا
وقت یوں انتقام لے گا
بلند آواز میں کہے گا
'شہید زندہ ہے، جی اٹھا ہے'
ابھی تو اُس کا
کفن بھی میلا نہیں ہُوا ہے

شہیدِ آبرو

وہ آدھی رات کو چھپ کر جگانے آئے تھے اُس کو
کہ دن کی روشنی میں
اُس سے آنکھیں چار کرنے کا نہیں تھا حوصلہ اُن میں
وہ گہری نیند سویا تھا، سحر کے خواب میں گم تھا
اُسے معلوم کیا تھا کون ہیں اُس کے تعاقب میں
جو شبخوں مار کر اُس کی متاعِ بے بہا کو لوٹنے آئے تھے
خود اپنی صلیبیں ساتھ لائے تھے
کہ وہ تو موت کو بھی خوابِ بیداری سمجھتا تھا
وہ گہری نیند سے جاگا تو اُس کے خواب کا چہرہ
وفورِ نور سے ایسے منوّر تھا
کہ جیسے رات کا سورج
سحر ہونے سے پہلے ہی اُتر آیا ہو زنداں میں

اُسے مصلوب کرنے والے ناداں یہ سمجھتے ہیں
بجھا وہ رات کا سورج سحر کا سلسلہ ٹوٹا
جو دیکھا تھا کبھی اک شخص نے وہ خواب تھا جھوٹا

انہیں معلوم کیا جو خواب سُولی پر لٹک جائے
حقیقت سے بھی اعلیٰ ہے
شہیدِ آبرو جو خون کی رنگیں قبا پہنے
عروسِ صبح تک جائے
وہی سب سے جیالا ہے
اُسی اک شخص کا اب عکس ہے دیوارِ زنداں پر
گلستاں پر گلستاں کی ہر اک شاخِ فروزاں پر
اُسے وہ لاکھ لے جائیں صلیب و دار پر
لیکن وہ پیارا شخص
اُس کا عکس مر کر مر نہیں سکتا
کہ اُس کا رات کے سورج سے ناطہ ہے
وہ اپنے چاہنے والوں کے میلے میں
مہکتی، جگمگاتی ہر سحر کے ساتھ آتا ہے

بیکراں

وجود میں بیکراں بھی تو تھا
عدم کی روحِ رواں بھی تو ہے
بہار کے درمیاں بھی تو تھا
صلیب کا ہم عناں بھی تو ہے

قلم بھی تجھ کو عزیز تر تھا
اگرچہ تلوار بھی تری تھی
زمینِ خفتہ بھی تیرا گھر تھا
نگاہِ بیدار بھی تری تھی

زمینِ خفتہ کے رہنے والے
نگاہِ بیدار سے نہ جاگے
ہزارہا زخم سہنے والے
زبانِ تلوار سے نہ جاگے

کچھ ایسے گرجے ہیں عدل پیشہ
جفائے جلّاد کانپ اٹھی ہے
کچھ ایسے برسا ہے تجھ پہ تیشہ
کہ روحِ فرہاد کانپ اٹھی ہے

یہ تیغِ جاں ہاتھ سے نہ چھوٹے
ہر امتحانِ وفا کڑا ہے
یہ دوستی مر کے بھی نہ ٹوٹے
قلم کا رشتہ بہت بڑا ہے

رتھ بان

یہ انساں ، رتھ بان ہے ایسا
جس کے ہاتھ میں وقت کی راسیں
صدیاں ، سال مہینے جس کے گھوڑے
گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ بھاگتے جائیں
گھومنے والی سخت زمیں کی گردش ماپتے جائیں
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ اُن کی بانی
لکھتی جائے ایک کہانی
ایک روانی اور حیرانی
سب کے دل میں اُس کی نشانی

یہ انساں ، رتھ بان ہے ایسا
چلتے چلتے
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ گیت سناتے گھوڑوں پر چابک برسائے
اُن کو اتنی طیش دلائے

وہ تاریخ کی راسیں توڑ کے سرپٹ بھاگیں
ذرّوں کے سینوں میں وہ کہرام بپا ہو
روئے زمیں پر ایک قیامت کا نقشہ ہو
یہ رتھ بان خود اپنی ہی رتھ،
اپنے ہی گھوڑوں کی زد میں آکر کچلا جائے
وقت کے ظالم پہیوں کی گردش میں
بوٹی بوٹی ہو کر
دُور دُور تک اُڑتا جائے
— گنبدِ روز و شب میں
اس رتھ بان کا گیت یہی ہے
چیخ یہی ہے
انساں کی تاریخ یہی ہے

نوائے فقیر

(اقبال کی صدائے بازگشت)

وہ نہ خواب تھا نہ خیال تھا، وہ ترا جلال و جمال تھا
نہ کوئی بھی تھا ترے رُوبرو کہ تُو آپ اپنی مثال تھا

یہ کہاں کسی میں تھا حوصلہ کہ وہ بارِ عشق اٹھا سکے
میں جواب بن کے مچل گیا، ترے لب پہ ایک سوال تھا

مہ و مہر میں کہاں آگہی کہ وہ گردشوں کے اسیر تھے
مجھے کائنات کی فکر تھی، انہیں صرف اپنا خیال تھا

مرے تجربوں سے قدم قدم مرا کل سنورتا چلا گیا
مری پُشت ماضی کی سمت تھی مرے سامنے مرا حال تھا

میں ہُوں زخم زخم اگر تو کیا، ہے رواں بہاروں کا قافلہ
سبھی وار تن پہ سجا لیے میں جہاں بھی تھا تری ڈھال تھا

میں نوائے دردِ فقیر ہُوں، میں جہاں کا حُسنِ ضمیر ہوں
میں بلند یال رہا سَدا نہ مجھے کہیں بھی زوال تھا

مِری آب و تاب کے سامنے نہ ٹھہر سکی کبھی تیرگی
میں چراغِ شب تھا جمیلؔ اگر تو یہ میرے فن کا کمال تھا
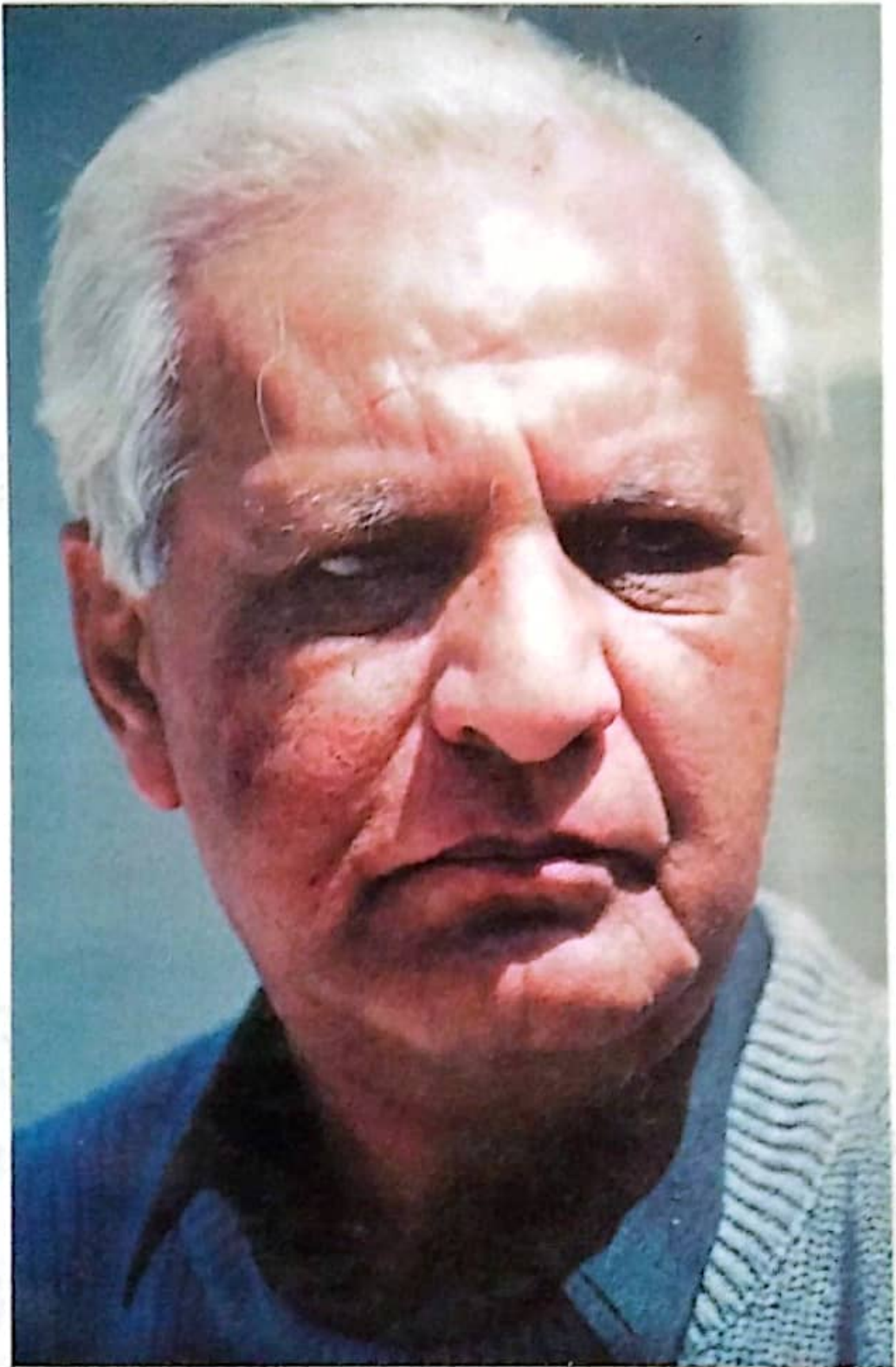
ہر ایک ہاتھ پہ خورشیدِ جاں چمکتا ہُوا
مہیب شب میں سحر کے نقیب لے کے چلے